شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم)

(تنقیدی مضامین و منتخب کلام)

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن ڈاٹ کام

شبیر ناقدؔ

شاعراتِ ارضِ پاک

(حصہ سوم)

(تنقیدی مضامین و منتخب کلام)

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن
ڈاٹ کام

شبیر ناقِدؔ

رنگِ ادب

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعرؔ
0345-2610434

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب	:	شاعراتِ ارضِ پاک (جلد سوم)
مصنف	:	شبیر ناقد (0333-5066967)
اشاعت	:	نومبر 2013ء
کمپوزنگ	:	ظفر اکیڈمی، کراچی
ناشر	:	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی
ای میل	:	rangeadab@Yahoo.com
تعداد	:	500
صفحات	:	240
قیمت	:	=/500روپے

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے

رنگِ ادب پبلی کیشنز

5۔کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

انتساب

اُن شاعرات کے نام جن کے احساسات

کی مہک سے گلشنِ شعر معطر و معنبر ہے

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

فہرست

مسطورات بحوالہ مستورات اہلِ سخن... ابوالبیان ظہور احمد فاتح	7
آزرین فرحت جدید امکانات کی شاعرہ	9
بتول صابری کی شاعری کی رومانی فضا	17
پروین شاکر احساسِ محبت کے آئینے میں	25
پروین نظیر سومرو ہجر و وصال کی شاعرہ	34
تسنیم عابدی کثیر الموضوعات شاعرہ	39
تزئین آرا زیدی کا کلام عصری بے حسی کے تناظر میں	45
ثروت ظفر بھرپور لہجے کی شاعرہ	52
جہاں آرا تبسم کی نظم اور نسوانی مسائل	57
حمیرا راحت تحیرِ عشق کی شاعرہ	62
درخشاں صدیقی کا اظہارِ معرفت	68
رخشندہ نوید محبت کے موسموں کی شاعرہ	75
ریحانہ روحی کے شعری تجربات	82
ریحانہ قمر کی فکری نادرہ کاریاں	88
زیب النساء زیبی کے بیتِ حزن	94
سیمیں برلاس اور عصری رویے	100

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

سحرؔ علی کی شانِ معاملہ بندی	106
شاہدہ لطیف، لطیف جذبات کی شاعرہ	111
شبہ طرازؔ نظمِ جدید کی شاعرہ	117
شگفتہ شفیقؔ فطری اظہار کی شاعرہ	123
شاہینہ عندلیبؔ روایتی طرزِ فکر کی شاعرہ	134
شائستہ سحرؔ کرب ذات کی شاعرہ	140
عابدہ کرامت کی فکری جہتیں	145
عنبریں حسیب عنبرؔ کی عمیق حسیات کی حامل شاعری	151
فہمیدہ ریاض کی نظم اور غیر روایتی تخیلات	157
ڈاکٹر فاطمہ حسن کے فکری زاویے	164
فاخرہ بتولؔ کی فکری عمومیت	170
فرحؔ اقبال کا کلام اور جوابی رویے	175
فرزانہ جاناںؔ ایک رومان پرور شاعرہ	181
کشور ناہیدؔ کے شعری رجحانات	196
گل زیب زیباؔ کا کلام اور عصری آشوب	201
مونا شہابؔ اور نئے شعری امکانات	207
ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ — عشق و الفت کی شاعرہ	214
نجمہ عثمانؔ کی شعری حسیات	223
نسیم آراء کی اضطرابیہ شاعری	229
شبیر ناقدؔ کے سوانحی اور فنی کوائف... شاعر علی شاعرؔ	234

مسطورات بحوالہ مستوراتِ اہلِ سخن

ابوالبیان ظہور احمد فاتح (تونسہ شریف)

خالقِ کائنات نے گلشنِ حیات پیدا فرمایا اور گلہائے رنگ و بو کو اصناف میں بانٹ دیا۔

حضرتِ انسان کے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لیے فنونِ لطیفہ کا اہتمام فرمایا اور ان فنون میں سے شعر و ادب کو نمایاں درجہ عطا فرمایا تخلیقِ آدم کو زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو گا کہ ابنائے آدم نے شعر گوئی کا آغاز کر دیا اس خوبصورت ہنر کی جب پذیرائی عام ہونے لگی اور اہلِ ہنر کے تاریخی انداز میں چرچے ہونے لگے تو بناتِ حوا بھی لجاتی ہوئی اس زمرے میں آ موجود ہوئیں پھر کیا تھا نسائی ادب کا آغاز ہو گیا کو بہ کو داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے اور شدہ شدہ شاعرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اگر ہم اردو شعر و ادب کا جائزہ لیں تو ابتدا میں خواتین اہلِ سخن انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔ تاہم سماجی جکڑ بندیوں میں کمی آنے اور باہمی رواداریوں میں اضافہ ہونے کی وجہ سے شاعرات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا جب مؤقر تالیف ''شاعراتِ ارضِ پاک'' کا آغاز کیا گیا تو یہ اندازہ قطعاً نہیں تھا کہ معاملہ کئی جلدوں پر پہنچ جائے گا اور اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بات چل نکلی ہے اب جانے کہاں تک پہنچے؟

نسائی شعری ادب کے حوالے سے جو نگارشات مجموعہ ہائے کلام کی صورت میں مجتمع ہوئیں یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ سب کا ہنر اعلیٰ مدارج کو پہنچا ہوا ہے البتہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ باہمت خواتین کی ایک جماعت میدانِ سخن میں گامزن ہو چکی ہے اور عمدہ سے عمدہ

شعری کاوشیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہم کسی خاص صنف کی وکالت پر کمربستہ نہیں ہیں اور نہ اس سے یہ مراد لی جائے کہ مردانہ وقار کو پسِ پشت ڈال کر طبقۂ نسواں کی جانبداری کی جا رہی ہے بلکہ ایک آزاد اور وسیع الذہن سخن شناس کی حیثیت سے قدر شناسی کے تقاضے نبھائے جا رہے ہیں۔ کتابِ ھٰذا میں جن مستورات کا کلام بلاغت نظام شامل کیا گیا ہے وہ یقیناً ہدیۂ تبریک کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے طور پر اور اپنے اپنے انداز میں گلشنِ اُردو میں گلکاریاں کرنے کی سعیِ جمیل کی ہے ہم اس موقع پر ناقدِ ادب شہیر ناقدؔ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ جن کی فکرِ شاقہ ایک خوبصورت گلدستۂ کلام اور ایک عمدہ تنقیدی اثاثہ بہم پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے ان کی تلاش و جستجو لائقِ تحسین ہے ان کا عزم قابلِ قدر ہے جس کے باعث ''شاعراتِ ارضِ پاک'' کی جلد سوئم بھی منصۂ شہود پر آ گئی ہے جس برجستہ اور غیر مبہم انداز میں انہوں نے شبانہ روز کام کیا ہے ہم اس پر انہیں شاباش کہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ جب تک اس حوالے سے کتب موصول ہوتی رہیں گی وہ اپنا سلسلہ دراز کرتے چلے جائیں گے۔

جنوں میں دیکھیے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے؟
پڑی ہے آبلوں میں پھوٹ اور ایکا ہے خاروں میں

ہم یہاں عظیم ماہر شاعر علی شاعر کو بھی ان کی بے لوث ادبی وابستگی اور لسانِ اردو کی آرائش گیسو پر ان کی ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہماری دعا ہے کہ قدرت کاملہ انہیں بھی بہتر سے بہتر مواقع سے نوازتی رہے اور وہ اپنی خدمات عروس شعر و ادب کے لیے بروئے کار لاتے رہیں۔

(آمین ثم آمین)

☆☆☆☆☆

آئرین فرحت جدید امکانات کی شاعرہ

وسائل کی عدم تقسیم، غربت و مہنگائی، لاقانونیت اور دہشت گردی عصرِ حاضر کے وہ مسائل ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کو یاسیت و قنوطیت کے دشت میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان نے زیست سے مفر کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیں جس کا اثر انسانی اخلاق اور رویوں پر بھی ہوا ہے یہی اثرات و شواہد ہمارے عصری ادب کا حصہ ہیں فن شعر کا نازک شعبہ بھی انہی حالات سے بری طرح متاثر ہوا مایوسیوں اور بیزاریوں نے شعری اظہار کا روپ دھار لیا اور قاری نے شعر و سخن سے کنارہ کشی اختیار کر لی جس کی وجہ سے شعر کا دائرہ کار محدود ہو کر قلم قبیلے تک رہ گیا اور تخلیق کیے جانے والا ادب بھی ادب برائے ادب کے زمرے کا حامل ہو گیا لیکن کچھ دور اندیش شعراء اور شاعرات نے اپنے فکری کینوس میں خوشی و مسرت، طرب و تمکنت اور جدید امکانات کا اہتمام کیا انہیں دور اندیش احباب میں ایک نام آئرین فرحت کا بھی ہے جنہوں نے قاری کا شعر و سخن سے منقطع تعلق کو استوار کرنے کی ایک سعیِ بلیغ کی ہے اس سے قبل کہ ہم مذکورہ موضوع کے تناظر میں ان کی غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ کریں ان کے سوانحی کوائف پر طائرانہ نظر ڈالنا بھی ضروری ہے کیونکہ ہر تخلیق اپنے تخلیق کار کی شخصیت کا پرتو ہوتی ہے عمرانی تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کے فن کا جائزہ ان کے عہد اور سوانحی حالات مدنظر رکھ کر لیا جائے آئرین فرحت 18 ستمبر 1969ء کو پیدا ہوئیں ان کی جنم بھومی ضلع سانگھڑ سندھ ہے ان کی شاعری کا آغاز اسکول کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا کیونکہ انہوں نے اسکول کی عمر میں ہی بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھنی شروع کر دیں تھیں رسمی تعلیم کا سلسلہ انہوں نے بی ایڈ اور ایم ایڈ تک پہنچایا درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں تا دمِ تحریر گورنمنٹ سیکنڈری ہائی اسکول

نورالاسلام کراچی میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہی ہیں ادبی تنظیمی حوالوں سے بہت سی وابستگیوں کی حامل ہیں کراچی برانچ کرسچن رائٹرز گلڈ کی جنرل سیکرٹری ہیں نائب صدر نوجوانانِ شہر کراچی ممبر آرٹس کونسل، کراچی چیئرپرسن دی سارنگ آرٹ ویلی کراچی اور کراچی کرائسٹ ٹائمز کی سب ایڈیٹر بھی ہیں ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں'' سے معنون 2013ء میں منصۂ شہود پر آیا جس میں غزلیں، آزاد نظمیں اور کچھ پابند نظمیں شامل ہیں مذکورہ کتاب کا ٹائٹل زیفرین کھوکھر کے آرٹ کا حسین شاہکار ہے ان کا کلام روزنامہ نوائے وقت، جسارت، آفتاب، نئی بات، اخبارِ جہاں، فیملی میگزین، غازی میگزین، ساون میگزین، دنیائے ادب کراچی، دی کرائسٹ ٹائمز کراچی، ادبِ معلیٰ لاہور اور عالمی رنگ ادب کراچی کی زینت بنتا رہتا ہے علاوہ ازیں گڈ نیوز ٹی وی، فیبا ریڈیو میں ''کتاب دوست'' اور ''غزل رنگ'' جیسے ادبی پروگرام کیے اور فیچر ٹریول سے متعلق کام کیا پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس اور اس کے علاوہ مذہبوں گیتوں کی میزبانی کا شرف بھی انہیں حاصل ہے میٹرو ٹی وی، پی ٹی وی سندھ ٹی وی اور پلے ٹی وی پر ان کے انٹرویوز بھی ٹیلی کاسٹ ہوئے ہیں اپنا ٹی وی، دھوم ٹی وی، گڈ نیوز ٹی وی اور جیو ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں کمپیئرنگ۔ ڈوکومینٹری اور ڈبنگ کا اعزاز بھی ان کے پاس ہے آئی ڈی شہباز ایوارڈ، عالمی مشاعرہ 2005ء، 2007ء کی نظامت کے فرائض کے ایوارڈ بھی انہوں نے حاصل کیے بے نظیر بھٹو آل پاکستان مشاعرہ کی نظامت، یونائیٹڈ چرچ آف پاکستان کی جانب سے حسنِ کارکردگی، کرائسٹ ٹائمز میگزین اور آفتاب نیوز پیپر کی جانب سے انہیں ایوارڈز سے نوازا جاچکا ہے پی ٹی وی کے لیے ایک طویل عرصہ سے کرسمس اور ایسٹر گیت لکھے اور کیسنس کے لیے بھی بے شمار گیت لکھے ان کے کچھ مشہور مذہبی گیت جو مختلف گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے گائے وہ درج ذیل ہیں:

1- فلک کے ستاروں نے نغمے سنائے (غلام عباس)

2- شامِ غم زندگی کی عطا ہے (انجمن سسٹرز)

3- خوشیاں گلے ملی ہیں نئی بات ہو گئی (سنبل نورین/آصف رضا)

4- جناں دے بند بوہے یسوع توں ای کھولنے (انجم عالم)

5- مریم کی گود میں چمکا وہ آفتاب (سنبل نورین)

6- پریشاں جدوں وی توہویں گا یسوع نال ہوئے گا (محمد علی)

7- یہ شب جو آج آئی ہے بہت ہی خوبصورت ہے (شبانہ جوزف)

8- محبت کی ادا کیسے جدا یہ سلسلہ کیسے! (جاوید نور/سنورینہ جاوید)

9- شکر اوسے داہر دم منا بندیا جنے دِتے تینوں زندگی دے ساہ بندیا۔
(وسیکیل ولائیت)

آزرین فرحت کے سوانحی حالات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ادبی حوالے سے بھرپور زندگی گزاری ہے اور مقبولیت و پذیرائی کی بے پناہ دولت سمیٹی ہے ہم ان کے مذکورہ مجموعہ کے ثلث اول کے منتخب غزلیات کے اشعار موضوع کی مناسبت سے شامل تجزیہ کرتے ہیں۔

ایک مہم جو طبیعت ہی انقلاب کی خواہاں ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کا ہنر جانتی ہے ہر مشکل سے مشکل کام کر سکتی ہے زیست کے مصائب و آلام کا ادراک اور منزل پر پہنچنے کے عزم صمیم سے ہی حیات کے روشن امکانات ضوپاش ہوتے ہیں جو انسان کو زندگی کرنے کی شکتی دیتے ہیں اذیتوں کے عہد میں وجۂ راحت بننے کی خواہش بھی ایک نوید سعید ہے غم والم سے نباہ کرتے ہوئے بھی حسرت و شادمانی کی توقع جدید امکانات کی وہ مشعل ہے جو سدا فروزاں رہتی ہے انہی افکار سے مرصع آزرین فرحت کی ایک غزل کے چار اشعار دیکھتے ہیں۔

ہوا کا رخ بدلنا چاہتی ہوں
کبھی پانی پہ چلنا چاہتی ہوں
میں رستوں میں الجھ کر رہ گئی ہوں
ہر منزل اترنا چاہتی ہوں

لہو کی سرخیاں پھیلی ہیں ہر سو
ہری اک شاخ بننا چاہتی ہوں
غموں کے ساتھ گزری زندگی پر
خوشی کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں

ان کے کلام میں بالیدہ فکری کے مظاہر وفور سے ملتے ہیں جس سے ان کی عمیق شعری ریاضت کی غمازی ہوتی ہے ان کے تخیلات میں چٹان جیسے حوصلوں کی داستان پائی جاتی ہے ان کا سخن امکانات کے نئے باب وا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ کٹھنائیوں کا سامنا کرنے کا جگر رکھتی ہیں اس لیے وہ رجائیت کے اعلیٰ وارفع مقام پر فائز دکھائی دیتی ہیں وہ غموں کے اتھاہ سمندر میں مسرت کے شواہد تلاش کرنے کا فن جانتی ہیں اسی حوالے سے ان کا ایک شعر اور مقطع لائق توجہ ہے۔

تشنہ ہونٹوں پر شبنم کی ایک ہی بوند
بوند کو پھر دریا ہونے تک دیکھا ہے
وقت خراشیں چھوڑ گیا ہے دل پر فرحتؔ
سوکھا پیڑ ہرا ہونے تک دیکھا ہے

آزرین فرحتؔ کے فکری کینوس میں انقلاب اور امکانات کا ایک جہان آباد ہے جہاں زندگی اپنی حقیقی صورت میں دکھائی دیتی ہے یہی سبب ہے کہ ان کے مخزن شعر میں آموزگاری کے بے انت شواہد ملتے ہیں اس لیے وہ جابجا اپنے قاری کو ایک نئے شعور سے ہم آہنگ کرتی دکھائی دیتی ہیں یہی سبب ہے کہ ان کا قاری شعور حیات سے مالا مال نظر آتا ہے یہی امر ان کی فکری بلوغت کی دلالت کرتا ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار درافقات پر دق الباب کر رہے ہیں۔

اک نئی تمنا کو دل میں پلنے دیتا ہے
اور ٹوٹ جانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے

خواہشوں کے جنگل میں دور دور جانا ہے
پھر پلٹ کے آنے کا حوصلہ بھی رکھنا ہے

اُن کی شاعری جدید امکانات کا وہ مخزن ہے جہاں کوئی موسمِ خزاں نہیں ہے یاسیت کی تیرگی کو چاک کرنے والی رجائیت موجود ہے آئرین فرحت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے حزن و ملال، قنوطیت، فکری خلفشار اور ذہنی تناؤ کے عہد میں نئے امکانات کی شمعیں روشن کی ہیں اس سلسلے میں ان کا عزم و ولولہ لائقِ صد ستائش ہے۔

محبت زرد موسم سے لپٹ کر جب بھی روتی ہے
تو بالوں میں گلابوں کو سجا کر دیکھ لیتے ہیں

وہ اپنے قاری کو زندگی کی زندہ دلی کا درس دیتی ہیں اس لیے ان کے سخن سے مسرت کے چشمے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کے ہاں مایوسیوں اور افسردگیوں کا کوئی گزر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ایک فکری ہشاشیت و بشاشیت پائی جاتی ہے بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح

زندگی زندہ دلی سے جو گزاری ہم نے
موت بھی دے کے ہمیں جام بقا گزرے گی

بقول کسے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اس حوالے سے ان کا نقطہ نظر دیکھتے ہیں۔

ٹوٹ جانا اور بکھرنا تو بہت آسان ہے
ہم نے سب ہنس کر گزارا زندگی کے کھیل میں

وہ اپنے ذاتی اور اکائی کا مکمل شعور رکھتی ہیں اور اپنی اہمیت سے آگاہ ہیں اس لیے ان کے ہاں تعلیاتی شواہد بھی ہیں اور ایک احساسِ خود محبوبی کی جھلک بھی ملتی ہے یہ وہ احساسات ہیں جو

انہیں رسی یاس نہیں ہونے دیتے جس سے ان کے ہاں جدید امکانات کے نئے باب وا ہوتے رہتے ہیں اور ان کی دوراندیشی کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

آج بھی کچھ کم نہیں ہیں چاہنے والے مرے
یاد آؤں گی تمہیں شدت سے مر جانے کے بعد

مشمولہ بسیط امکانی مظاہر اس امر کے بھرپور عکاس ہیں کہ آزرین فرحتؔ کے ہاں جدید امکانات وفور سے پائے جاتے ہیں جس سے ان کے ادب برائے زندگی کے نظریے کی تصدیق ہوتی ہے اگر اسی تواتر اور سرعت سے ان کا شعری ریاض جاری و ساری رہا تو آوازوں کے اس ہجوم میں اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

آرین فرحت (کراچی)

میں سچے ہاتھ سے تھاموں تو شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں
جو تم سے بات کرتی ہوں تو باتیں ٹوٹ جاتی ہیں

محبت کے یہ رشتے دھڑکنوں کے ساتھ ہوتے ہیں
کہ دل کا روگ لگنے سے یہ سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں

جو دن بھر کی مسافت بعد یہ چاہا کہ سو جاؤں
ذرا سی آنکھ کیا لگتی ہے راتیں ٹوٹ جاتی ہیں؟

زمین و آسماں کا فرق تو حدِ نظر کا ہے
کہاں تک باندھ پاؤ گے یہ ذاتیں ٹوٹ جاتی ہیں؟

مری سوچوں پہ پہرے کیا بٹھائیں گے جہاں والے؟
کہ فرحت قید کرتے ہی سلاخیں ٹوٹ جاتی ہیں

آرین فرحت (کراچی)

سوچتی ہوں بھنور میں رہتی ہوں
یا میں پانی کے گھر میں رہتی ہوں

ان ستاروں کی چال ہے کوئی
جو انہی کے اثر میں رہتی ہوں

بات بھی مختصر سی کرتی ہوں
پھر بھی ہر اک خبر میں رہتی ہوں

چھپتی پھرتی ہوں اپنے آپ سے میں
اور ہر اک نظر میں رہتی ہوں

پاؤں سے دائرے نہیں جاتے
ہر قدم پر سفر میں رہتی ہوں

بسمل صابری کی شاعری کی رومانی فضا

شاعری ایک درپن ہے جس میں طرح طرح کی تصاویر گوناگوں عکس اور پر تو تجربات شاعر از راہِ واردات دکھاتا رہتا ہے ایک جذبہ ایسا بھی ہے جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتا ہے اور اس کی وسعتیں آفاقی ہوتی ہیں یہ جذبہ انس، پیار، محبت اور عشق کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے علاوہ ازیں خوش ذوقی اور شوقِ جمال بھی اسی ذیل میں شامل ہیں ان جملہ کوائف کو اگر کسی ایک نام سے پکارا ہو تو وہ نام ہے ''رومان'' یہ لطیف جذبوں کی کہکشاں ہے اور شاعری جس کا شمار فنونِ لطیفہ میں کیا جاتا ہے اس کے بغیر بے مزہ اور نا تمام ہے۔

بہت سے شعراء ایسے گزرے ہیں جن کی شاعری میں رومانی فضا اجاگر ہو رہی ہے جیسے شاعرِ رومان اختر شیرانی اور عصرِ حاضر میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح جن کی شاعری سر بسر رومان میں ڈوبی ہوئی ہے بسمل صابری کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بھی یہ خوشگوار حیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ ان کے سخن میں ماشاءاللہ خاصی رومانی کیفیت پائی جاتی ہے شذرہ ھذا میں ہم بسمل صابری کی رومانی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کا شعری سفر انتہائی سرعت سے جاری و ساری ہے ان کے تا دمِ تحریر تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں شعر کی دیوی ان پر یوں مہربان ہے کہ خود ان کے بقول ''تخیلات موزوں اشعار کی صورت ان کی سطحِ ذہن پر وارد ہوتے ہیں ان کے ہاں فطری طور پر عروضی تلازمات کا التزام پایا جاتا ہے اس سلسلے میں انہیں کسی ذاتی یا کسبی کاوش کے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑتا۔'' بسمل صابری کا تعلق ساہیوال سے ہے اور گورنمنٹ کالج آف

ساہیوال سے اردو ادبیات کی ریٹائرڈ پروفیسر ہیں ہنوز ان کے نیل ونہار گیسوئے شعر سنوار نے میں مصروف ہو رہے ہیں اُن کے تیسرے شعری مجموعہ مطبوعہ جون 2013ء ''یادوں کی بارشیں'' کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

بتول صابری کے ہاں محبت کے عمیق جذبات و احساسات پائے جاتے ہیں جس سے اُن کے تجربے اور مشاہدے کی غمازی ہوتی ہے رومانی حوالے سے اُن کی فکر گیرائی و گہرائی کی حامل ہے رومان نگاری کی نسبت سے ان کا فکری کینوس بہت وسیع ہے جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے مبرا و ماورا ہے اُن کی محبت سماج میں خوشگواری اور لطافتوں کو فروغ بخشتی ہے اور پورے ماحول میں ایک نکہت بیز منظر چھا جاتا ہے محبوب کا دعاؤں میں در آنا اور سوندھی سوندھی خوشبو کا فضاؤں میں بکھرنا بے انتہا محبت کی عمدہ تمثیل ہے اس حوالے سے اُن کی غزل کا ایک شعر دیدنی ہے۔

خوشبو ہے سوندھی سوندھی ہر سو فضاؤں میں
یہ کون آ گیا ہے مری سب دعاؤں میں ؟

اُن کے ہاں رومان کے جذبے بے انت اور شدت وحدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں بتول صابری کے شعری مخزن میں جہاں محبت کی وسعت کا تذکرہ ہے وہاں راہِ الفت کی دشواریوں اور کٹھنائیوں کا بیان ذیشان بھی ہے۔

محبت ایسا دریا ہے کنارا مل نہیں سکتا
یہ رستہ ہے بہت دشوار سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے

عصر حاضر میں وہ محبتوں کی بے مائیگی پر نوحہ کناں اور محو فغاں ہیں محبت کے تقدس کے معدوم ہونے پر شاکی ہیں ان کے نزدیک چاہت جو ایک پوتر جذبہ تھا نہیں رہا الفتوں کی ایسی صورتِ حال پر اُن کا دل کڑھتا ہے اور اُن کا شعور بین کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے عصری الفت کو وہ کاروبار گردانتی ہیں جہاں اندیشۂ سود و زیاں بھی ہے۔

مرا احساسِ عرفاں آج بھی روتا ہے محفل میں

محبت کا یہ کاروبار سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے

مذکورہ اشعار کے علاوہ بھی ان کے بے شمار اشعار ہیں جو ان کے احساسِ محبت کے آئینہ دار ہیں قارئینِ شعر و سخن کے ذوقِ طبع کے لیے بدونِ تبصرہ زیبِ قرطاس ہیں۔

☆

دل کے وہ تار جو میں نے کبھی چھیڑے ہی نہ تھے
ہجر کا ساز تو وہ خود ہی بجانے آئے

ہر نئی شام نیا درد لیے آتی ہے
عشق کا روگ مرے ہوش گنوانے آئے

☆

کبھی سوچا نہ تھا رستے میں مجھ کو چھوڑ جائے گا
یہی ہے کیا محبت کا صلہ کہنا ہی پڑتا ہے

☆

تمہاری یاد بھی اب ساتھ ساتھ رہتی ہے
دیارِ عشق میں اس کو قیام ہو جائے

☆

جنوں کے جذبے جھلک رہے ہیں خوشی مناؤ
کہ جام سارے کھنک رہے ہیں خوشی مناؤ

☆

اے محبت ترے خمار میں ہوں
گیت گاتی ہوں ان بہاروں میں

مذکورہ چند تصریحات رومان نگاری کے حوالے سے اُن کے مجموعی کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں

جس سے یہ احساس حدِ تیقّن کو پہنچتا ہے کہ نجل صابری عالمِ رومان کی شاعرہ ہیں ان کے ہاں لطافتوں کے پیرائے میں محبتوں کی داستاں کہی ہوئی ہے ہماری دعا ہے اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن ڈاٹ کام

بسمل صابری (ساہیوال)

جنوں کے جذبے جھلک رہے ہیں خوشی مناؤ
کہ جام سارے کھنک رہے ہیں خوشی مناؤ

حیا کے آنچل سرک رہے ہیں خوشی مناؤ
وفا کے آنسو ڈھلک رہے ہیں خوشی مناؤ

حسیں گلوں سے ہے منظروں میں جمال ایسا
کہ رنگ سارے چھلک رہے ہیں خوشی مناؤ

حسیں پرندے وطن کے ورثے کا گیت گا کر
عجیب دھن میں چہک رہے ہیں خوشی مناؤ

WWW.URDUSUKHAN.COM THE HOUSE OF URDU LITERATURE

یوں گلستاں میں بہار خوشبو لٹا رہی ہے
وہ ہوش میں بھی بہک رہے ہیں خوشی مناؤ

نئی رتوں میں چمن کا ایسے مزاج بدلا
کہ سنگ ریزے چمک رہے ہیں خوشی مناؤ

گداز جسموں میں شور ایسا جلالتوں کا
وہ خواب میں بھی مٹک رہے ہیں خوشی مناؤ

پرندے شاخِ چمن گلے سے لگا رہے ہیں
گلوں کو جیسے تھپک رہے ہیں خوشی مناؤ

کئی پرندے نکل کے جنگل سے اُڑ گئے ہیں
وہ پانیوں پہ مٹک رہے ہیں خوشی مناؤ

یہی تو نقشِ وفا ہے بسمل ہر اک فنا کو
یہ سنگ سارے دمک رہے ہیں خوشی مناؤ

بسمل صابری (ساہیوال)

اب عرضِ ہُنر کرنے کا امکاں نہیں ہوتا
کیوں درد کے ماروں کا بھی درماں نہیں ہوتا؟

اک بزم سجائی تھی ترے پیار کی خاطر
گھر دل کی زمیں پر کوئی آساں نہیں ہوتا

احساسِ تغافل ہی سے میں شعلہ نوا ہوں
ہر شعرِ سخن تو مری پہچاں نہیں ہوتا

غم ہائے زمانہ تو ملے چاروں طرف سے
یہ درد چھپانا کوئی آساں نہیں ہوتا

کھنڈرات کی عظمت کا تو اندازہ ہے مجھ کو
آئینہ مجھے دیکھ کے حیراں نہیں ہوتا

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

آنگن میں تو گھر کے کبھی اگتی نہیں فصلیں
رستے میں کہیں کوئی بیاباں نہیں ہوتا

کر دیتا ہے جو جان فدا پیار کی خاطر
اک بھوک کی خاطر کوئی ناداں نہیں ہوتا

کرلیتا ہے نفرت میں کبھی پیار کا سودا
محبوب تو ہوتا ہے مری جاں نہیں ہوتا

شاید کوئی منظر ہو نہاں خانۂ دل میں
ہر نخلِ بہاراں تو گلستاں نہیں ہوتا

اب رونقِ بازار کہاں میرے نگر میں؟
دل جس سے بہل جائے وہ ساماں نہیں ہوتا

آغازِ سفر صرف ارادے میں ہے پنہاں
بے عمل کوئی رستہ کبھی آساں نہیں ہوتا

پروین شاکر احساسِ محبت کے آئینے میں

عمومی مشاہدے کی بات ہے کہ مرد کی نسبت صنفِ نازک میں احساس الفت فزوں تر پایا جاتا ہے۔نسائی احساسات اس امر کی غمازی کرتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ہندی گیتوں میں عورت کی حیثیت عاشق کی سی ہوتی ہے۔اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ بنتِ حوا کا دامن محبت کے جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔اس لیے عمومی رومانوی افکار کو نسائی جذبات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عورت چاہت کی پتلی ہے،الفت کی دیوی ہے۔آج ہمارا موضوعِ سخن پروین شاکر کی محبت سے لبریز شاعری ہے۔آج ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''خوشبو'' کے ربع اوّل کے منتخب غزلیہ اشعار زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔

ان کے خیالات نادرالنظیر ہیں۔اسلوب جاذبیت سے لبریز ہے۔عمومی احساسات بھی اپنے اندر انفرادیت کا پہلو خود میں سموئے ہوئے ہیں۔ان کے افکار قارئین کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں اور وہ ایک دل دوز کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔اسی حوالے سے ان کی غزل کے چار اشعار لائقِ التفات ہیں۔

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

بعض اوقات ان کے ہاں بیزاری بھی خوشگواری کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتی ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں اختصار و جامعیت ہے جو انہیں دیگر ہم عصر شاعرات سے ممتاز و منفرد کرتی ہے۔ اکثر اوقات ان کے ہاں نسائی خیالات بھی غیر روایتی انداز میں ملتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو اشعار دیکھتے ہیں۔

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی دلہن کی خوشبو
پیرہن میرا مگر اس کے بدن کی خوشبو
اس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

ان کے افکار محبت سے لبریز ہیں جن میں پھولوں کی خوشبو بھی ہے زخموں کا کرب بھی، ہجر و وصال کے فسانے بھی ہیں کہیں روٹھنے کا مذکور ہے تو کہیں منانے کا ماجرا۔ ان کا عشق جنوں کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ قارئین کے ذوقِ طبع کی نذر ان کی غزل کے پانچ اشعار ہیں۔

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے
میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ مرے گھر کے در و بام سجانے آئے
اس سے اک بار تو روٹھوں میں اسی کی مانند
اور وہ میری طرح مجھ کو منانے آئے

اسی کوچے میں کئی اس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور کے ملنے کے بہانے آئے

اب نہ پوچھوں گی میں کھوئے ہوئے خوابوں کا پتا
وہ اگر آئے تو کچھ بھی نہ بتانے آئے

محبت یا رومان ان کے کلام کا مستقل حوالہ ہے۔ جا بجا وہ چاہتوں کے پھول بکھیرتی نظر آتی ہیں، گویا وہ سراپا رومان ہیں۔ ان کی ایک غزل بدون تبصرہ دنیائے سخن کے متوالوں کے لیے زیبِ قرطاس ہے۔

چہرہ میرا تھا نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی

میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی

شوخ لمحوں کا پتا دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی

ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں شامیں اس کی

دھیان میں اس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی یادیں اس کی

رنگ جوئیدہ وہ آئے تو سہی
پھول تو پھول ہیں شاخیں اس کی

فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا
آندھیاں میری بہاریں اس کی

خود پہ کھلتی نہ ہو جس کی نظر
جانتا کون زبانیں اس کی؟
نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے بانہیں اس کی

ان کا اسلوب انتہائی شستہ اور رواں دواں ہے ان کے ہاں ایک خود کلامی کا سا انداز ہے معاملہ بندی ہے، مکالمہ نگاری ہے۔ الغرض تمام شعری خصائص موجود ہیں جو ایک صحت مند شعری روایت کا حصہ ہیں، جذبوں میں شدت وحدت ہے، حزن والم اپنی انتہا کو چھوتا نظر آتا ہے ان کے ہاں تقیدی رویے وفور سے پائے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک کرب وسوز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں حقیقی زندگی کے خدشات بھی اپنے کروفر سے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں وسیع وعمیق مشاہدات کا فروغ بھی ہے ان کی ایک پوری غزل لائق توجہ ہے۔

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اٹھتی ہوں میں سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی
میں تو اس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں

اب کسی اُمید سے دروازے سے نہ جھانکے کوئی

کوئی آہٹ ، کوئی آواز ، کوئی چاپ کہیں

آس کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

ان کے ہاں حسرتوں کا دکھ بھی ہے، ادھورے سپنے بھی ہیں، آس اور امید کے بھی کئی پہلو ملتے ہیں۔ان کے ہاں رجائیت بھی پورے طور پر پرَتو فگن ہے،کہیں کہیں ان کے ہاں دعائیہ انداز بھی ملتا ہے۔ان کے موضوعات میں تنوع ہے طرح طرح کے خیالات قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتے ہیں۔ان کے اشعار دل کے تاروں کو چھونے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔یہی ان کی مقبولیت اور پذیرائی کا سبب ہے۔ایک اور غزل کے دو اشعار قابلِ غور ہیں۔

کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے

کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو

کبھی تو ہو مرے کمرے میں ایسا منظر بھی

بہار دیکھ کے کھڑکی سے مسکرائی ہو

وہ انسانی نفسیات کا عمیق ادارک رکھتی ہیں۔وہ اپنے محبوب کے حوالے سے تمام تر جزیات کو شعری پیرہن عطا کرتی ہیں۔ان کی غزل رومان سے شروع ہوتی ہے اور رومان پر ختم ہوتی ہے جس کا ابتدائیہ، وسطانیہ اور اختتامیہ سب رومان ہی ہے۔نسائی احساسات کی کسک بھی ہے جو اپنے مخصوص رنگ و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ان کی شاعری جوان جذبوں کی شاعری ہے اس لیے وہ نوجوان طبقے میں بے حد مقبول ہیں۔ہر موسم اور ہر رُت میں ان کے افکار سدا بہار نوعیت کے ہیں۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ہر عہد کی شاعری ہے۔ان کی ایک جذبہ محبت سے لبریز غزل ملاحظہ ہو۔

بعد مدت سے اسے دیکھا لوگو!

وہ ذرا بھی نہیں بدلا لوگو!

خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو!
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا لوگو!
اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا لوگو!
دوست تو خیر کوئی کس کا ہے؟
اس نے دشمن بھی نہ سمجھا لوگو!
رات وہ درد مرے دل میں اٹھا
صبح تک چین نہ آیا لوگو!
پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا لوگو!

ان کے ہاں محبت کے جذبے نرالے اور اچھوتے انداز میں ملتے ہیں۔ سوز و گداز بھی ہے، تنہائی اور رسوائی بھی ہے۔ جاں سپاری بھی ہے اور فرماں برداری بھی۔ ان کی غزل کے پانچ اشعار دیدنی ہیں۔

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں
تو مرا کچھ نہیں لگتا مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
سب ضدیں اس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اسے ہنستا دیکھوں

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی روپ میں مہکتا دیکھوں
تو میری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

پروین شاکر کے کلام کے بنظرِ غائر مطالعے سے اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ رومان نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کے جذبات و احساسات نسائیت آمیز بھی ہیں جن سے ایک اپنائیت کا احساس چھلکتا ہے۔ پروین شاکر ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہیں ہر عہد میں پڑھا اور سراہا جائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پروین شاکر کے محبت آمیز، لطیف نسوانی جذبات کے عمیق کے ساتھ ساتھ قدرتِ کلام اور حسنِ بیان بھی پورے طور پر بہار آفریں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خوبصورت الفاظ ہاتھ باندھے ہوئے ان کی قرینہ کاری کے منتظر ہیں۔

☆☆☆☆☆

پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے؟
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا ، لوٹا تو مرے پاس آیا؟
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو ، تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

پروین شاکر

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے؟
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی؟

اب اس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی؟

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اُٹھاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی

پروین نظیر سومرو ہجر و وصال کی شاعرہ

عشق ہجر و وصال سے عبارت ہے یہ دونوں کیفیات حزن و مسرت سے نسبت رکھتی ہیں جن میں واردات دل بھی ہوتی ہیں اور جذبات دل بھی ہوتے ہیں آج ہم پروین نظیر سومرو کے سخن کے حوالے سے رقمطراز ہیں ان کے اباء و اجداد کا مولد و مسکن حیدر آباد دکن تھا جو بعد میں ہجرت کر کے کراچی میں اقامت پذیر ہوئے ان کے کلام میں ہجر و وصال کے شواہد بکثرت ملتے ہیں عشق و الفت کے حوالے سے عمومی اور روایتی خیالات ہیں جو عام طور پر نسائی خیالات کا حصہ ہوتے ہیں ان کے شعری مجموعہ ''بے صدا در یچے'' کے چند منتخب غزلیہ اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شامل شذرہ ہیں یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اس کی اشاعت 2005ء میں عمل میں آئی کتاب ھذا کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

شاعری بنیادی طور پر عشق سے جنم لیتی ہے وہ عشق حقیقی یا مجازی کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے جس میں مرور ایام کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات بھی در آتے ہیں یہی صورت حال پروین نظیر سومرو کے کلام کی ہے۔

محبوب حسن اور احساس حسن کا مرقع ہوتا ہے اسی لیے اس سے جفاؤں کا صدور ہوتا رہتا ہے جب کہ اس کی جفا شعاری کے باوجود بھی محبّ سے وفاؤں کا اعادہ ہوتا رہتا ہے اصل میں جفاؤں کے بدلے وفائیں کرنا ہی اصل محبت ہے اس طرح کے روایتی خیالات ان کی غزل کے دو اشعار

میں مشاہدہ کرتے ہیں جن میں انہوں نے پوری داستان ہجر سمو دی ہے۔

میں ہر قدم پہ جس کا سہارا بنی رہی
وہ دو گھڑی کو میرا سہارا نہیں ہوا
ہم اُس کی چاہتوں کو لیے در بدر پھرے
وہ غیر کا ہوا تو ہمارا نہیں ہوا

عالمِ ہجراں سوز و گداز سے نسبت رکھتا ہے جب کہ قرب ایک بہار آفریں کیفیت کا نام ہے ان کے ہاں جہاں ہجر کے مصائب و آلام کا تذکرہ ہے وہاں وصل کا کیف و سرور ہے اس لیے حزنیہ اور طربیہ حوالے ساتھ ساتھ ملتے ہیں بسا اوقات ان کا پیرائیہ اظہار جدت سے مملو ہوتا ہے عام طور پر وصل کی ساعتیں مختصر دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کے ہاں اس حوالے سے قناعت پسندی ملتی ہے اس لیے انہیں وصل کا ایک پل صدیوں پر محیط لگتا ہے اس نسبت سے ان کی غزل کا ایک شعر دیدنی ہے۔

اک عشق کی قربت نے کیا وقت کو یوں قید
صدیوں پہ ہے پھیلا ہوا بس قرب کا اک پل

ان کے تخیلات میں ہجر کی اذیتیں بھرپور انداز میں ملتی ہیں کیونکہ عالمِ ہجراں عشاق کے لیے قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں ہوتا فرقت کا دکھ بہت ہی اذیت ناک ہوتا ہے جس میں سانسیں سزا بن جاتی ہیں فراق کا لمحہ لمحہ کسی ابتلا سے کم نہیں ہوتا ان کی غزل کا مقطع لائقِ توجہ ہے۔

ہو گئیں بچھڑے مدتیں پروین
ہم کو اک پل نہ چین آیا ہے

وصل کی نسبت ان کے ہاں ہجر کے حوالے بکثرت ملتے ہیں اس لیے وہ مقدر سے شاکی نظر آتی ہیں مسلسل ہجر کو اپنے مقدر سے منسوب کرتی ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

معلوم ہے ساتھ رہو گے نہ تم سدا

یہ سانحہ لکھا ہے مقدر کے باب میں

جب وصل کی شدت جسم و جاں میں سرایت کرتی ہے تو پھر محبوب کے حوالے سے خیالات ضرورت بن جایا کرتے ہیں ملن میسر آنے پر تخیل شدت و سرعت اختیار کر جاتا ہے ان کا ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

سارے بدن میں وصل کی حدت ہے ان دنوں
اُن کا خیال میری ضرورت ہے ان دنوں

اگرچہ پروین نظیر سومرو کا فکری کینوس وسیع و بسیط ہے مگر ان کے ہاں ہجر و وصال کے شواہد وفور سے ملتے ہیں اگر ان کی شعری ریاضت تسلسل سے جاری رہی تو دیگر موضوعات بھی کثرت سے ان کے لیے آغوش کشا نظر آئیں گے۔

☆☆☆☆☆

پروینؔ نظیر سومرو (کراچی)

دل کا نقشہ بدل ہی جاتا ہے
کیا قیامت یہ عشق لاتا ہے؟

میں ہوں اُس کی لگن میں برگشتہ
وہ مرے حوصلے بڑھاتا ہے

لگ گئی آگ دل میں اب دیکھو
کیسے وہ آگ کو بجھاتا ہے؟

یاد کے سرمئی دھندلکوں سے
ایک سایہ ہمیں بلاتا ہے

اب بھی تنہائی میں تجھے پروینؔ
کیوں وہ ہرجائی یاد آتا ہے؟

پروین نظیر سومرو (کراچی)

زندگی گزری کسی کو پوجتے
دوسرے قصے ہمیں کیا سوجھتے؟

اک معمہ تھا عجب وہ جانِ جاں
اک پہیلی تھا سو کیسے بوجھتے؟

خود ہمیں رونے سے فرصت ہی نہ تھی
کیا بھلا آنسو کسی کے پونچھتے؟

دل کی جانب دیکھتے ہم کس طرح؟
وقت گزرا زندگی سے جھونجھتے

ہم نے جانا حرفِ آخر آپ کو
ورنہ لگتے کچھ ہمیں بھی سوجھتے

تسنیم عابدی کثیر الموضوعات شاعرہ

دنیائے شعر بہت وسیع ہے تخلیق کی چند غزلیات و منظومات ہر کوئی کہہ لیتا ہے لیکن زیست کے بیشتر موضوعات کو اپنے سخن میں جگہ دینا یقیناً کارِ دشوار ہے اور فکری وسعت کا متقاضی ہے شذرہ ھذا میں ہم تسنیم عابدی کے سخن کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کا موضوعاتی کینوس بسیط و عمیق ہے جنہوں نے کراچی کے محلہ پیر کالونی میں 5 فروری 1961ء میں جنم لیا ان کے آبا و اجداد کا مولد و مسکن لکھنؤ ہے ان کے ننھیال اور ددھیال ابھی تک لکھنؤ میں مقیم ہیں اس لیے ان کے کلام میں لکھنوی تہذیب و تمدن اور ادبی روایت کے خد و خال مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اور کراچی کی ادبی فضا کا رنگ بھی ہے ہجرت کا کرب بھی ان کے ہاں نمایاں ہے شذرہ ھذا میں ہم اُن کے اولین شعری مجموعہ ''صحرا، آنکھیں اور تنہائی'' کے منتخب غزلیہ اشعار موضوعاتی وسعت کے تناظر میں شامل تجزیہ کرتے ہیں مجموعہ ھذا کی طباعت 1998ء میں عمل میں آئی مذکورہ مجموعہ کا نام جہاں فکری وسعت و جدت کا عکاس ہے وہاں حزنیہ شعری طبع کا غماز بھی ہے۔

کسی بھی شاعر کی سخن سنجی میں اس کے ذاتی حالات و واقعات کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے شعر اپنے خالق کا فکری و فنی پرتو ہوتا ہے تسنیم عابدی کے خاندان نے چونکہ ہجرت کا کرب جھیلا اس لیے ان کے ہاں حزنیہ افکار بکثرت ملتے ہیں جو کہیں رومانوی تناظر میں رونما ہوئے ہیں تو کہیں سماجی پس منظر میں۔ اس لیے ان کے کلام میں کرب و سوز کی ایک فضا پائی جاتی ہے اسی نسبت سے ان کی ایک پانچ شعری غزل دیکھتے ہیں۔

کیوں شناسائی کا گہرا زخم بھرتا ہی نہیں؟
دل تو کب کا مر گیا ارمان مرتا ہی نہیں؟
آس کے سارے ستارے جھلملا کر بجھ گئے
اے شبِ فرقت مرا سورج ابھرتا ہی نہیں
خواہشوں کی سوگواری زیست کی بے چہرگی
اے غمِ دنیا ترا چہرہ سنورتا ہی نہیں
حبس ہے چاروں طرف چھایا فضائے ذہن میں
تجلۂ جاں سے کوئی جھونکا گزرتا ہی نہیں
عشق کی مے پی کے دل مجذوب ہوتا جائے ہے
نشہ سنتے ہیں کہ چڑھ کر یہ اترتا ہی نہیں

عشق انسانی انفاس میں جذب ہو جاتا ہے جس سے جذب وشوق کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے پھر بے کلی و بے خودی تواتر سے فزوں تر ہوتی رہتی ہے عشق میں تحلیلِ نفسی کے پہلو کو انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں باندھا ہے۔

کس قدر تقسیم ہوتے جا رہے ہیں عشق میں؟
خرچ ہو جائیں نہ ہم خود کو بچا رکھا نہیں

ہجرت کی اذیت سے وہی آشنا ہوتا ہے جو اس اذیت سے ہم آغوش ہوا ہو وہی اس کے مصائب وآلام کا مکمل ادراک رکھتا ہے قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کا کثیر تعداد میں بھارت سے پاکستان میں آنا برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کی بہت بڑی ہجرت تھی جس میں کئی گھروندے بکھر گئے اور بے شمار خواب چکنا چور ہو کر تعبیر سے محروم ہو گئے اس حوالے سے اُن کی ایک غزل کا مطلع دیدنی ہے۔

اک گھروندا تھا وہ بکھرا کیسے؟

خواب تعبیر سے بچھڑا کیسے؟

فطری طور پر ہر انسان کو بچپن عزیز ہوتا ہے وہ شاید اس لیے کہ اس دورِ ہستی میں انسان ہر قسم کی ذمہ داری اور مصائب و آلام سے مبرا و ماورا ہوتا ہے اس لیے بچپن کی یادیں حسین ہوا کرتی ہیں بچپن جوش و خروش سے عبارت ہوتا ہے جب ہوش آتا ہے تو پھر جوش فرو ہو جاتا ہے اس لیے بچپن کی یادیں انسان کا سرمایۂ حیات ہوا کرتی ہیں اُن کی غزل کا مطلع لائقِ توجہ ہے۔

بچپنے کے وہ دلکش زمانے گئے
ہوش آیا تو سپنے سہانے گئے

اُن کے تخیلات میں حقیقی زندگی کا عمیق شعور ملتا ہے اس لیے ان کے ہاں زیست کے اسرار و رموز ملتے ہیں اس لیے آموزگاری کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے قاری کو حیات کے شعور سے آشنا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ان کے نزدیک حزن والم زندگی کا جزو لاینفک ہے اس لیے ان کے کلام میں درد سے موانست و مصالحت کی فضا ملتی ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار ملاحظہ کریں۔

تم زیست گزاری کا ہنر بھول نہ جانا
آ جائے سفر راس تو گھر بھول نہ جانا
اے چارہ گرو درد کے بڑھنے کی دوا دو
اے بے خبرو! میری خبر بھول نہ جانا
دی خانہ بدوشی نے مجھے کہہ کے تسلی
ہے زیست کا مقصد ہی سفر بھول نہ جانا

اُن کے افکار میں جدت و رفعت کے مظاہر ملتے ہیں اُن کے تخیلات نادرالنظیر ہیں اُن کے ہاں زیست کی بے ثباتی کا مذکور ہے حزن و ملال کے حوالے ہیں انتشارِ ذات کی عمدہ تمثیلات ہیں ان کی غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

زندگی کے باب حرف مختصر ہونے لگے
شب کی تاریکی میں سائے معتبر ہونے لگے
کس ریاضت سے نشیمن تھا بنا اور کس طرح؟
ایک ہی جھونکے سے تنکے منتشر ہونے لگے

مذکورہ استشہادات تسلیم عابدی کے شعری کینوس کی چند جھلکیاں ہیں اگر طولِ بیاں سے گریز مطلوب نہ ہوتا تو ان کے بہت سے شعری نوادرات زیبِ قرطاس کرتے اور ان کی موضوعاتی وسعت کو مزید اشکار کرتے ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں موضوعات بکثرت ملتے ہیں اگر ان کی شعری ریاضت تسلسل سے جاری وساری رہی تو صفحۂ ہستی کے مزید موضوعات کا اہتمام اپنے سخن میں انتہائی قرینے سے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی اور اپنے ادبی مقام و مرتبے کو مزید اُجاگر کر پائیں گی۔

☆☆☆☆☆

تسنیم عابدی (کراچی)

کوزہ گری کے شوق میں حد سے گزر گئے
آئے جو دن بہار کے سب پھول مر گئے

رستے پہ قافلے کو لگا کر گزر گئے
اپنے ہنر سے گیسوئے گیتی سنور گئے

کس کا خیالِ حسن تصور میں آ گیا؟
دیکھو تفکرات کے چہرے سنور گئے

شاید وہ فصلِ گل کے پیمبر ہیں اس لیے
آمد سے ان کی پھول چمن میں نکھر گئے

وہ علم اور عقل کا پیکر ہیں اس لیے
اہلِ جنوں جو ان کی نظر سے اتر گئے

تسنیم عابدی (کراچی)

تم میرے دردِ دل میں شرکت نہیں کرو
سرمایۂ حیات پہ حیرت نہیں کرو

آنچل کو میرے سر سے اُڑنے کی جستجو
اے موجۂ ہوا یہ شرارت نہیں کرو

اے دورِ بے ہنر یہاں تسکینِ ذوق میں
گر ہاتھ بھی قلم ہو تو حیرت نہیں کرو

پیاسوں کا امتحان ہے دریا کے سامنے
عباس مشک بھرنے کی زحمت نہیں کرو

سیدانیوں کے سر سے رداؤں کو چھیننا
اے بانیٔ جفا یہ قیامت نہیں کرو

WWW.URDUSUKHAN.COM THE HOUSE OF URDU LITERATURE

تزئین آراء زیدی کا کلام

عصری بے حسی کے تناظر میں

میکانی عہد کی ترقی کا ثمر یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کا جنازہ اُٹھ چکا ہے معاشرتی خلوص و مروت ناپید ہے ایک افراتفری اور نفسانفسی کا سماں ہے جس کے باعث انسانیت شکوہ کناں ہے لبوں پر شکوہ اور آہ و فغاں ہے باہمی چاہت و الفت اپنی بساط لپیٹ چکی ہے معاشرہ طبقوں میں منقسم ہو گیا ہے پھر بھی ہم بے خبر و بے نیاز ہیں بصد فخر و امتیاز کہتے ہیں کہ انسان نے چاند پر رسائی حاصل کر لی دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کر لیا ہے پہاڑوں کا سینہ چیر کر دریا اور نہریں بہا دیں۔ سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی میں تہلکہ مچا دیا ہے یہ کمالات انسانی ترقی کے شاہد نہیں یہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی استشہادات ہیں دنیا کی جو قومیں مہذب ہونے کی دعویدار ہیں طرح طرح کے معاشرتی مسائل سے دوچار ہیں تہذیب نو کے تمام تر دعوے کھوکھلے اور بے بنیاد ہیں جہالت کے تمام تر خبائث عصر حاضر میں بھی فروغ پا رہے ہیں بقول راقم الحروف ؎

جو تھے جہالت کے سب خبائث وہ اس جہاں میں بھی جلوہ گر ہیں
عبث ہیں تہذیب نو کے دعوے روا ہے اب کے بھی کاروکاری

سماج کا باشعور اور دانشور طبقہ ایک عمیق اذیت سے دوچار ہے جسے دنیا کے مسائل کا حل کسی نہج پر نظر نہیں آتا ایسی تمام تر صورت احوال نے ایک عصری بے حسی کو جنم دیا ہے جہاں مروت پامال ہے اور خلوص کنگال ہے بقول راقم الحروف ؎

یہ اب کے کیسی ہوا چلی ہے؟

جہاں میں ہر سمت بے حسی ہے

ہر عہد کا ادب اپنے عصری مزاج کا ترجمان ہوتا ہے نتیجتاً ہمارا ادب بھی عصری رجحانات سے متاثر ہوا ہے خصوصاً فن شاعری میں اس کے شواہد بکثرت پائے گئے بہت سے شعراء و شاعرات نے انہیں موضوعات کا اہتمام کیا طبقۂ اناث کی شاعری میں ایک نام تزئین آراء زیدی کا بھی ہے جن کے کلام میں عصری بے حسی کی تمثیلات فور سے ملتی ہیں۔

تزئین آراء زیدی کے سوانحی کوائف کی جھلک کچھ یوں ہے ڈیرہ غازی خاں جنوبی پنجاب میں پیدا ہوئیں ایم اے اردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا اور بی ایڈ ایجوکیشن کالج ملتان سے کیا علاوہ ازیں ڈی ایچ ایم ایس بولان ہومیو میڈیکل کالج سے اور ڈی سی ایس ویمن ٹیکنیکل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کوئٹہ سے کیا سید رضا حامد زیدی سے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئیں اور کراچی میں اقامت اختیار کی سندھ پنجاب اور بلوچستان کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔

ان کا اولین شعری مجموعہ ''رازداں'' ہے جو 2003ء میں منصۂ شہود پر آیا دوسرا شعری مجموعہ ''مضراب رگ جاں'' ہے جو 2011ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا ان کے دوسرے شعری مجموعہ کے حوالے سے اقتدار جاوید یوں رقم طراز ہیں۔

''تزئین کا شعر عصری صورت حال پر خندہ زن بھی ہے اور نوحہ کناں بھی۔ شعر کا بنیادی وظیفہ موجودگی ترجمانی بھی تو ہے۔''

عصری حالات نے ایک غیر یقینی صورت حال اختیار کر لی ہے جس میں دنیا و مافیہا کی ہر شے نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے اور اپنی بساط لپیٹ لی جس کا نتیجہ بیزاری کی صورت میں نکلا آدمیت نے اپنا اعتماد کھو دیا اور آدمی نامعتبر ٹھہرا اسی عصری بے حسی کے پہلو کو انہوں نے اپنی غزل کے مطلع میں یوں نبھایا ہے۔

دوستی نامعتبر ہے دشمنی نامعتبر

آدمیت بے بھروسہ آدمی نا معتبر

جا بجا وہ اپنے عہد سے نالاں نظر آتی ہیں اس لیے ان کے ہاں نالہ وشیون کے پہلو بکثرت ملتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں یاسیت وقنوطیت کی ایک لہر محسوس کی جا سکتی ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کریں۔

نالہ و فریاد کو اپنائیں کیا؟
وقت کی بے مہریاں سنوائیں کیا؟
وقت ہی باقی بچا ہے کس قدر؟
کارکل ہستی کو اب سلجھائیں کیا؟

تزئین آرا زیدی نے حالات کی واژگونی سے عمیق اثر قبول کیا ہے اس لیے ان کی قوت متخیلہ میں اس کی لازوال امثال ملتی ہیں ان کے افکار میں بے سکونی کی کیفیات کا مذکور ہے اس لیے کبھی زندگی انہیں درد کا بھنور لگتی ہے تو کبھی رنج و آلام کا سفر لگتی ہے ہر گھڑی ہر وقت عدم تحفظ کا احساس ہے جو پروان چڑھ رہا ہے بقول راقم الحروف۔

غیر محفوظ اپنا جیون ہے
در کو اپنے کھلا نہیں رکھتے

یہی احساسات عصری بے حسی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں انہیں تاثرات کی ترجمانی تزئین آرا زیدی کی زبانی دیکھتے ہیں۔

زندگی درد کے بھنور میں ہے
رنج و آلام کے سفر میں ہے
ہر گھڑی ہے فنا کے رستے پر
ہر گھڑی موت کی نظر میں ہے
آؤ پڑھ لیں دعائے رد بلا

زیست آسیب کے اثر میں ہے

انسانی بے حسی کو وہ انفرادی اور اجتماعی ہر حوالے سے مذموم سمجھتی ہیں اور اسے ہدفِ تنقید بناتی ہیں ان کی انفرادیت بھی اجتماعیت کی غماز معلوم ہوتی ہے۔

کیا کسی کی سرد مہری پھر نتیجہ خیز ہے؟

ہو رہے ہیں رفتہ رفتہ یوں مرے اعصاب شل

ہمارے سماج میں خود غرضی نے ایسے پنجے گاڑے ہیں کہ کوئی خوشی خوشی نہیں لگتی تمام تر رونقیں اور رعنائیاں ماند ہیں ایک مہیب تیرگی چھائی ہے جس میں روشنی پر بھی روشنی کا گماں نہیں ہوتا۔

روشنی میں رہ کر بھی لوگ اس زمانے کو

کیا سبب ہے کیوں آخر روشنی نہیں کہتے؟

وہ نا مساعد حالات کا ذمہ دار انسان کو ٹھہراتی ہیں وہ عہد رفتہ اور اسلاف کی عظمت کے گن گاتی ہیں جب تمام تر مسائل کا ذمہ دار انسان خود ہے تو گلہ کس سے کریں اور کس سے منصفی چاہیں اس سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر ان کی غزل کے دو اشعار دیئے ہیں۔

شکایت کریں کس سے بیداد کی؟

یہ دنیا تو خود ہم نے ایجاد کی

یہ وحشت تو اس دور کی دین ہے

وراثت نہیں ہے یہ اجداد کی

مذکورہ استشہادات اس امر کی کافی وشافی شاہد ہیں کہ تزئین آراء زیدی کے شعری کینوس میں عصری بے حسی کے بے پناہ شواہد ہیں جو ان کی فکری بالیدگی کے مظہر ہیں اسلوب شفاف اور شستہ ہے جو خیالات کی سچائی سے ڈھلا ہوا ہے اگر چہ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے لیکن ان کے شعری ارتقا کا سفر حوصلہ افزا ہے یہ امر لائقِ طمانیت ہے کہ انہوں نے دیگر شاعرات کی طرح اپنے

خیالات کا تانا بانا روایتی موضوعات پر استوار نہیں کیا دعا ہے کہ رب ادب ان کے فکر و فن کو دولت دوام سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

تزئین آراء زیدی (کراچی)

جو شجر بہار میں جل گیا وہ سبھی رتوں کو بدل گیا
گیا اعتبارِ بہار جب تو خزاں کا ڈر بھی نکل گیا

یہ نصیحتیں تری ناصحا! لگیں معتبر تو بڑی مگر
میں کروں بھی کیا یہ دردِ دل رہِ اعتبار میں پل گیا؟

یہ بھی شکر ان سے پہل ہوئی کہ جو تو ڑا رشتہ وفاؤں کا
تھا جو ایک دھڑکا لگا ہوا وہ ہمارے دل سے نکل گیا

انہی موسموں کا طلسم تھا انہی وحشتوں کا گمان تھا
دلِ ناتواں کسی طور جب نہ تڑپ سکا تو سنبھل گیا

غمِ آرزو ترے شہر میں دلِ زار کا جو ہوا گزر
کبھی خاروخس سے لپٹ گیا کبھی سنگِ در سے بہل گیا

تزئین آراء زیدی (کراچی)

وقت کی گردش تھی سب ہی سکندر ہو گئے
ہم اسیرانِ وفا ، نذرِ مقدر ہو گئے

روزنِ زنداں سے پہنچی روشنی کی اک کرن
اور پھر ایسا ہوا دیوار میں در ہو گئے

آگہی کا کیف جب سے ہو گیا حاصل مجھے
دیدہ و دل کے لیے بے کیف منظر ہو گئے

دَورِ پتھر کا نہیں لیکن ہمارے عہد میں
دل جو سینوں میں دھڑکتے تھے وہ پتھر ہو گئے

شکوۂ حالات کی مجھ میں سکت باقی نہیں
اور وہ سمجھے مرے حالات بہتر ہو گئے

جن کو مہر و ماہ و انجم سے نہیں نسبت کوئی
آسمانِ زندگی کے ماہ و اختر ہو گئے

بے ضمیروں کے لیے نہیں بام و در کی راحتیں
ہاں مگر تزئین ہم جیسے تو بے در ہو گئے

ثروت ظفر بھرپور لہجے کی شاعرہ

فن شاعری میں کسی بھی شاعر کے ہاں شعری تاثر کا بھرپور انداز میں پایا جانا سخنور کے بالیدہ فکر اور فرخندہ نصیب ہونے کی علامت ہے یہ سعادت زیست کے نشیب و فراز کے عمیق ادراکات کا ثمر ہوتی ہے اور تلخ حقائق کا شعور اسے جلا بخشتا ہے شاعر فطری طور پر حساس طبع کا حامل ہوتا ہے اور یہ حساسیت مختلف شعراء و شاعرات میں کم یا زیادہ پائی جاتی ہے جنہیں مشیت سے یہ دولت فزوں تر ودیعت ہوتی ہے اُن کا لہجہ بھرپور اور افکار میں شدت وحدت کے مظاہر نمو پاش ہوتے ہیں فکری اعتبار سے اُن کے ہاں سرمایۂ حزن و ملال بھی وافر انداز میں ملتا ہے آج ہم ثروت ظفر کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں اُن کا شعری مجموعہ ''ہاتھوں میں چاند'' جس کی اشاعت دوم 2005ء میں ہوئی کے نصف اول کے منتخب غزلیا شعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شامل تجزیہ کرتے ہیں ثروت ظفر کا تعلق کراچی سے ہے۔

زیست شکست و ریخت کے عمل سے گزر کر اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہے جہاں جنوں اور وحشتیں بھی انسان کی دامن گیر ہوتی ہیں جو غم و الم کی مختلف کیفیات سے عبارت ہیں وہ ان واردات کی تخفیف کی متمنی ہیں ان کے تفکرات میں اسلامی افکار بھی جھانکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں امامِ عالی مقام سے اُن کی محبت و عقیدت بھی مثالی نوعیت کی حامل ہے اور وہ اسے روح کی طمانیت کا سبب گردانتی ہیں ہجرتوں کا کرب بھی اُن کے تخیلات سے چھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اُن کا شعری کینوس سفر، ماں، دعا، ہجرت اور کربلا کی فکری تخمیس کے گرد بھرپور انداز میں محوِ طواف ہے یہ

سب بھر پور اظہار کی تمثیلات ہیں اسی تناظر میں اُن کی غزل کے چار اشعار زیب قرطاس ہیں ۔

شکست و ریخت کے مرحلے میں کاش کوئی
مرے جنوں کو مری وحشتوں کو کم کر دے
ترس رہی ہوں کوئی ماں سا مہربان وجود
دعائے نور پڑھے اور مجھ پہ دم کر دے
مرے خدا تری دنیا میں ایک نام حسین
سکون قلب کو دے اور آنکھ نم کر دے
ازل سے تا بہ ابد ہجرتیں مقدر ہیں
مرے خدا مرا تھوڑا سفر تو کم کر دے

دل جو مسکنِ آرزو ہے جہاں تمام تمنائیں پنپتی ہیں آرزوؤں کا خون من دھرتی کو حسرت زار بنا دیتا ہے یہی حسرتیں انسان کو دولت ضبط سے ہم آغوش کرتی ہیں جس سے انسانی کردار کی تعمیر و تربیت ہوتی ہے اسی حوالے سے اُن کی ایک غزل کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے ۔

مسکنِ آرزو مسمار ہوا ہے لیکن
حسرتِ دل ہے کہ تعمیر ہوئی جاتی ہے

اُن کے ہاں کومل جذبوں کی بازیافت ملتی ہے وہ فکری لطافتوں اور نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھتی ہیں جن سے اُن کی گہری حساسیت کی غمازی ہوتی ہے فکری گہرائی و گیرائی اُن کی پذیرائی کا سبب ہے رفعتِ تخیل کا حامل اُن کی ایک اور غزل کا ایک شعر دیکھتے ہیں ۔

کہنا سورج سے آنکھ مت کھولے
پھول پر گھر بنا ہے شبنم کا

بسا اوقات وہ ایک شعر کے پیمانے میں بہت سے فکری تلازمات یکجا کر دیتی ہیں جس سے اُن کی فنی پختگی آشکار ہوتی ہے کسی بھی کیفیت کسی بھی واردات کو وہ بھر پور تاثرات کے

ساتھ زیبِ قرطاس کرتی ہیں وہ اپنے موضوع کو دفعتاً سمیٹنے میں بخوبی کامیاب نظر آتی ہیں اس لیے اُن کے ہاں عمیق جزیات کا ظہور ہوتا ہے ندرتِ خیال کا حامل اُن کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

لفظ ساکت ہونٹ جامد آنکھ پتھرائی ہوئی
کشتِ جاں میں خامشی کا بولنا کیسا لگا؟

اُن کے ہاں نادرالنظیر ترکیبات بھی ہیں جو اسلوب میں ایک شانِ دل آویزی پیدا کر رہی ہے جگہ جگہ صنائع بدائع بھی خوشہ چینیاں کر رہے ہیں تلمیحی حوالے بھی ہیں ذیل کی غزل کے ایک شعر میں شہزادہ سلیم اور انارکلی کی عشقیہ داستان کی خوبصورت تلمیح ہے جس میں انارکلی کے دیوار میں چنوائے جانے کا مذکور ہے۔

جرمِ الفت آخرش ثابت ہوا
وہ پسِ دیوار چنوائی گئی

متذکرہ استشہادات سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ ثروت ظفر کا شعری لب و لہجہ بھرپور تاثر کا حامل ہے جس میں جذبوں کی شدت وحدت بھی ہے اگر تسلسل سے اُن کی مشاطگیِ سخن جاری و ساری رہی تو اُن کے فکر و فن سے مزید بالیدگی کے مظاہر جلوہ ریز ہوں گے جن سے اُن کی فنی جلا فزوں تر ہو جائے گی۔

☆☆☆☆☆

ثروت ظفر (کراچی)

دل میں رہنا نظر میں رہنا ہے
گردشِ بام و در میں رہنا ہے

شوقِ پیمائشِ سفر تھا بہت
عمر بھر اب بھنور میں رہنا ہے

لہریں گننے کا شوق لے بیٹھا
یوں ہی مد و جزر میں رہنا ہے

ہم کہ ٹھہرے رفیقِ بادِ صبا
یوں مسلسل سفر میں رہنا ہے

اس کو اخبار سے شغف ہے بہت
روز تازہ خبر میں رہنا ہے

حق پرستی نے وہ دیا ثروت
شوقِ بارِ دگر میں رہنا ہے

ثروت ظفر (کراچی)

سوال کرتے ہیں چہرے تمہاری ماؤں کے
کہاں گئے جو محافظ تھے ان رداؤں کے؟

میں اب کے سال بڑی آفتوں کی زد پر ہوں
حصار ٹوٹ رہے ہیں مری دعاؤں کے

وہ جاتے جاتے بھی رستہ ہمیں بتا کے گیا
ہیں سنگِ میل کی صورت نشان پاؤں کے

حویلیاں انہیں زنداں سے کم نہیں لگتیں
جنہیں پسند ہیں کچے مکان گاؤں کے

ہنسی لبوں پہ مگر دل میں آبلے رکھنا
یہ حوصلے ہیں فقط درد آشناؤں کے

کبھی دعا تو کبھی آس ٹوٹ جاتی ہے
ہیں میرے ساتھ بہت سلسلے بلاؤں کے

وہ چل پڑا ہے مگر راستے میں ثروت
پیام آنے لگے ہیں مجھے ہواؤں کے

جہاں آراء تبسم کی نظم اور نسوانی مسائل

طبقۂ اناث کی شاعری میں نسائی احساسات کا ہونا ایک فطری امر ہے بہت سی شاعرات نے اپنے کلام میں اس نوع کے افکار کا برملا اظہار کیا ہے ہر شاعرہ نے صنفِ نازک کی بے بسی کے فسانے اور نوحے لکھے ہیں لیکن کسی شاعرہ نے خالصتاً نسوانی مسائل کو براہ راست موضوع نہیں بنایا یہ اعجاز و افتخار صرف جہاں آراء تبسم کو حاصل ہے جس نے اپنے مجموعۂ کلام ''مجھے خطبہ نہیں آتا'' جو تمام تر نظمیات پر مشتمل ہے اس میں نسوانی مسائل کو براہ راست اجاگر کیا گیا ہے مجموعہ ھٰذا میں انہوں نے ایک گھریلو اور سماجی عورت کی مکمل داستانِ حیات سمو دی ہے آج ہم اُن کی منتخب نظموں کے منتخب اقتباسات کو برائے تجزیہ بطور استشہادات لائیں گے۔

انہوں نے اپنی نظمیات میں بنتِ حوا کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرنے کی بھی مقدور بھر کوشش کی ہے اس نسبت سے انہوں نے کائناتی اور الہامی حوالے بھی دیئے ہیں اس سلسلے میں ان کی نظم ''تعارف'' کا اولین اقتباس دیکھتے ہیں۔

میں فطرت کی نمائندہ
میں قدرت کی تراشیدہ
میں کائنات کی تصویر کا رنگین ظاہر ہوں

میں کائنات کی تصویر کا پاکیزہ باطن ہوں

میں رشتوں کا تقدس ہوں

اساطیری کتابوں میں لکھا ہے

میں مقدس ہوں

صنفِ نازک کو مختلف نوع کے سماجی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کچھ رویے باعثِ کرب بھی ہوا کرتے ہیں جو احساسات کو زخمی کر دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے حوا کی بیٹی بہت حساس ہوتی ہے وہ سماج کی ہر اچھی اور بری نظر کا ادراک رکھتی ہے اس حوالے سے ان کی نظم ''موت مسکراتی ہے'' کا نصف اول لائقِ التفات ہے۔

میں دفتر جاؤں یا بازار جاؤں

میں اپنے دوستوں، غیروں میں اپنوں میں

جہاں بھی ہوں

مجھے میرا بدن تکلیف دیتا ہے

ان گنت نظروں کے

ایسے زخم لگتے ہیں

کہ جن کو

صرف میں محسوس کرتی ہوں

ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جس میں مرد کی حیثیت حاکم کی سی ہے اور عورت کی حیثیت محکوم کی سی ہے ایک سماجی عورت کو معاشرے میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں آرا تبسم نے اپنی نظم ''مجبوری'' کے اقتباس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ ایک کارکن عورت کی مجبوریوں کی داستاں سمو دی ہے۔

میں فائل لے کے جب بھی

باس کے کمرے میں جاتی ہوں

وہ فائل کی بجائے صرف

مجھ کو دیکھتا ہے

جہاں آرا تبسم کا یہ مجموعۂ کلام زیادہ تر آزاد نظمیات پر مشتمل ہے جب کہ ہر نظم میں انہوں نے عورت کے کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو اشکار کرنے کی سعی جمیل کی ہے ان کے خیالات میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع نہیں ہے ہر قسم کی منع کاری سے مبرا و ماورا ہیں تمام تر افکار فطری نوعیت کے ہیں بہر حال انہیں نظم کے میدان میں مزید ریاضت کی ضرورت درکار ہے تا کہ اعلیٰ معیار کے تقاضے پورے ہو سکیں خداوند قدوس ان کے قلم کو مزید روانیوں اور جولانیوں سے نوازے۔ آمین

☆☆☆☆☆

جہاں آراءتبسم (کوئٹہ)

میں بے چراغ رہ گئی ہوں، لازوال روشنی
مری طرف بھی اک نظر کبھی اُچھال روشنی

بجھے دنوں کے اجر میں، شبِ سیاہ صبر میں
مرے لیے بھی وقت لائے بھر کے تھال روشنی

کوئی سراب دیکھ لوں، کوئی تو خواب دیکھ لوں
بس ایک بار کاسۂ نظر میں ڈال روشنی

میں شہرِ بے بصر کو یہ بتا بتا کے تھک گئی
ہے زخمِ شب کا صرف ایک اندمال روشنی

ہوا نے میری آنکھ میں جلے چراغ کھا لیے
لبوں پہ آ کے مر گیا، ترا سوال روشنی

ملامتوں کی سب ہوائیں مری سمت چل پڑیں
میں بن گئی تھی شہر میں تری مثال روشنی

میں اشک پی کے رہ گئی، تبسمِ سیاہ پر
بہت ہوا ترے لیے، مجھے ملال روشنی

جہاں آراء تبسم (کوئٹہ)

وہ مجھے اتنی سہولت تو نہیں دے سکتا
کم سے کم اپنی محبت تو نہیں دے سکتا

اختیارات مجھے سارے عطا کر دے گا
ہاں مگر دل پہ حکومت تو نہیں دے سکتا

سوچ سکتی ہوں کسی اور کے بارے لیکن
دل مجھے اتنی رعایت تو نہیں دے سکتا

میں نے روتے ہوئے یہ بات بہت سوچی ہے
وہ مجھے اشکِ ندامت تو نہیں دے سکتا

اپنا کہہ کر وہ مجھے ذہن میں رکھ سکتا ہے
وادیٔ دل میں سکونت تو نہیں دے سکتا

چند سانسیں مجھے جینے کے لیے دے دے گا
عمر بھر جینے کی مہلت تو نہیں دے سکتا

میں تبسم ہوں مگر وہ مجھے محفل میں کبھی
مسکرانے کی اجازت تو نہیں دے سکتا

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

حمیرا راحتؔ، تحیّرِ عشق کی شاعرہ

شاعری ایک خداداد ملکہ ہے یہ جس فہم و ذکا کو ودیعت ہوتا ہے وہ اپنے فکر وفن کی بدولت گلشن شعر کو رنگا رنگ پھولوں سے سجا دیتا ہے اور گوناگوں خوشبوؤں سے مہکا دیتا ہے عصر حاضر میں بہت سے شعراء اور شاعرات نے اپنی عرق ریزیوں سے اقلیم سخن کو مالا مال کر رکھا ہے ایسے ہی اصحاب کمال میں سے حمیرا راحتؔ کا نام فکری وفنی اعتبار سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ان کے جذبات واحساسات ندرت سے لبریز ہیں انہوں نے فکر کے فرسودہ طرز کو منتخب نہیں کیا بلکہ نئے خیالات کو جادۂ منزل بنایا وہ ایک طویل عرصے سے ریاض سخن میں محو ہیں اُن کے ہاں فکری اعتبار سے وہ جولانی اور تابانی پائی جاتی ہے جو قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اُن کا کلام از آغاز تا اختتام دولتِ تحیّر سے معمور ہے مصرع در مصرع شعر در شعر غزل در غزل نظم در نظم بین السطور ان کے افکار ضوفشانی کر رہے ہیں ان کی شاعری میں نسائی احساسات کا رنگ بھی چوکھا ہے اسی حوالے سے وہ خواتین کی نمائندہ شاعرہ بھی کہلانے کا استحقاق رکھتی ہیں شذرہ ہٰذا میں اُن کے شعری مجموعہ تحیّرِ عشق کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ حمدیہ غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

میں تیرا نام جب لیتی ہوں دل سے
مقدر پاؤں میرے چومتا ہے

شعرِ ہٰذا ایک سادگی حسن کا حامل ہے وہ گویا ہیں کہ ذکر خدا ایسا بابرکت ومقدس ہے جب میں اس عظیم ہستی کا نام لیتی ہوں تو مقدر مجبور پا بوسی ہو جاتا ہے یہ شعر ایک فطری نوعیت کا حامل

ہے جو ہر نوع کے تصنع سے مبرا و ماورا ہے ۔

محبت کی عدیم الفرصتی میں
اُسے چاہا مگر سوچا نہیں ہے

میرا راحت کی سب سے بڑی فکری و فنی خاصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی سادگی کے ساتھ گہری رمز کی بات کر جاتی ہیں اور یہ امر اُن کے اسلوب کا خاصہ ہے اس شعر میں محبت میں فرصت کی نایابی کا مذکور بھی ہے کہ محبوب کو چاہا ہے اور سوچا نہیں ہے یہاں لفظ سوچا خود میں ایک جہانِ معنی سموئے ہوئے ہے غور و فکر بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور نقدِ احساس بھی ۔ یہ شعر اُن کی فکری و فنی ندرت پر دال بھی ہے ۔

احساسِ ذات کے حوالے کا حامل شعر دیکھیں ۔

بھری کائنات میں قید ہوں
میں حصارِ ذات میں قید ہوں

مطلع ہذا میں مصرع اول ایک احساسِ تنہائی پر دلالت کر رہا ہے وہ اپنے آپ کو بھری کائنات میں قید متصور کر رہی ہیں جس سے دنیا سے بیزاری کا احساس نمو پا رہا ہے ایک صوفیانہ سوچ کی غمازی ہے اور ایک اسلامی فکر کی عکاسی ہے کہ دنیا مومن کے لیے ایک قید خانہ ہے دوسرا مصرع ذاتی عرفان پر مبنی ہے کیوں کہ انسان کے دروں میں بھی ایک دنیا آباد ہوتی ہے کچھ لوگ اس میں کھونے کے بعد سلوک کی دیگر منازل طے کرتے ہیں یہ شعر اُن کی داخلیت کا بھرپور مظہر ہے اور دروں بینی کی عمدہ مثال ہے اور ''میں قید ہوں'' کی ردیف بھی اسلوبیاتی قرینہ کاری ہے ۔

ایک اور شعر میں اُن کی فکری کرشمہ کاری دیدنی ہے ۔

کیوں گھور اندھیرا ہے مقدر میں تمہارے؟
بجھتے ہوئے سورج کی کرن پوچھ رہی ہے

کسی بھی شاعر یا شاعرہ کا کمالِ فکر یہ ہوتا ہے کہ اُس سے مظاہرِ فطرت ہم کلام ہوں یہی

سلیقہ اُن کے اس شعر میں جلوہ نما ہے یہ شعراُن کی خزینہ شعری طبع کی عکاسی بھی کرتا ہے وہ پر ملال جذبوں کی امین بھی ہیں۔

اب اُن کی قناعت پسندی کے حوالے کا شعر دامن توجہ تھام رہا ہے۔

اک کرن چاندنی کی مل تو گئی
یہ بھی مہتاب کی نوازش ہے

اس شعر میں فکری طور پر وہ بہت قانع نظر آ رہی ہیں وہ حریص نہیں ہیں بلکہ شاکر و صابر ہیں وہ حرص وہوس جیسے سماجی خباثت سے ماورا ہیں چاندنی کی ایک کرن میسر آنے پر بھی وہ اسے مہتاب کی نوازش سے تعبیر کرتی ہیں اُن کی فکر سے سلوک کی راہیں نکلتی ہیں جو قاری کو اس مخصوص فضا میں لے جاتی ہیں جہاں دل ودماغ کو سکون مطلوب ہے۔

ایک طرفہ تخیل کا حامل شعر لائق التفات ہے۔

اک لمحۂ موجود مرے پاس کھڑا ہے
اک لمحۂ معدوم مجھے ڈھونڈ رہا ہے

یہ شعر ندرتِ تخیل کا شاہکار ہے جس میں صنعتِ تضاد کا دربار رو رو ہوا ہے موجود کے لیے معدوم لایا گیا ہے پاس کے لیے ڈھونڈ رہا گیا ہے اس شعر میں اُن کی قوتِ متخیلہ پورے طور پر جلوہ گر ہوئی ہے۔

اُن کی غزل کا ایک مطلع توجہ طلب ہے۔

زمانہ آشنا ہونا پڑے گا
مجھے تجھ سے جدا ہونا پڑے گا

یہ ایک ایسا شعر ہے جسے آپ معرفت ومجاز دونوں پر مہمیز کر سکتے ہیں اسی لیے وہ اپنے محبوب سے عرض پرداز ہیں کہ زمانے سے آشنائی کے لیے تجھ سے جدا ہونا ضروری ہے عشق و دنیا دو الگ الگ ترازو ہیں دونوں کا ایک ساتھ ہونا محالات میں سے ہے۔

میرا راحت کے شعری تجزیہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی ہے کہ اُن کے فکری کینوس میں وفورِ عشق والفت کے احساسات پائے جاتے ہیں اور تحیر جس کا مرکزی وکلیدی خاصہ ہے اگرچہ انہوں نے پر زور اور موثر نظمیں بھی کہی ہیں لیکن اُن کی غزل ان کی نظم سے کہیں آگے ہے ان کا کلام فکری اور اسلوبیاتی حوالے سے بھی قاری کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے بہر حال ابھی انہیں غزل کے میدان میں مزید ریاضت کی ضرورت ہے ابھی ان کے فکر وفن کو مزید بالیدگی مطلوب ہے اگر ان کی مشاطگیِ عروسِ سخن جاری رہی تو ان کی شاعری میں اور نکھار پیدا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

حمیرا راحت (کراچی)

محبت ہر طلب سے ماورا ہے
تو کیوں دل اس کو پانا چاہتا ہے؟

مرے ہاتھوں میں اک جلتا دیا ہے
اور اک آندھی کا مجھ کو سامنا ہے

دکھا دے کوئی تیرے ساتھ چل کے
نبھانا تجھ کو میرا حوصلہ ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تجھ کو
پلٹ جانے کا رستہ مل گیا ہے

گلے، شکوے، ملامت، نارسائی
یہی میری محبت کا صلہ ہے

حمیرا راحت (کراچی)

اُفق پر ایک آندھی سی اُٹھی ہے
دیئے کی لو بہت سہمی ہوئی ہے

کسی کردار کے آنسو ہیں شاید
کہانی میز پر بھیگی پڑی ہے

شکستہ خواب ، آنسو اور جدائی
محبت میں بڑی دردِ سری ہے

ابھی تک میں سمجھ نہ پائی نہیں جاناں
تمہارے بعد یہ کیسی کمی ہے؟

اندھیروں کے حوالے کر گیا جو
اسی کے دم سے مجھ میں روشنی ہے

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

درخشاں صدیقی کا اظہارِ معرفت

یہ صانع لوح وقلم کا کرم ہے جسے فکر وفن کی دولت گراں مایہ سے نوازدے مشیتِ ایزدی کی صوابدید کی بدولت افکار کا تقدس ودیعت ہوتا ہے وہ جسے چاہے عرفانِ خالق کائنات سے نوازدے ایں سعادت بزورِ بازو نیست خالقِ ارض وسما کی ذات کا ادراک عقیدت ومحبت ہی معرفت ہے جسے تصوف کا نام دیا جاتا ہے اپنی اپنی سوچ کے زاویے ہیں کہ کوئی مجاز پہ جاں چھڑکتا ہے تو کوئی حقیقت پہ جاں نچھاور کرتا ہے مذہب وحکمت عقل وبصیرت کی رو سے معرفت کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے ارباب دانش کے افکار کی روشنی میں معرفت ہی سرچشمۂ حیات ہے جس سے خلوص و مروت وعقیدت اور الفت کے گلستانوں کی آبیاری ہوتی ہے ہمیں درخشاں صدیقی کے شعری مجموعہ ''صبحِ درخشاں'' مطبوعہ جنوری 2010ء کے بغور مطالعہ کے دوران اظہارِ معرفت کے شواہد بکثرت میسر آئے ہیں جو اُن کے پورے جذبوں کی عکاسی کرتے ہیں یہ اُن کا اولین شعری مجموعہ ہے درخشاں صدیقی کا سوانحی حوالہ یہ ہے کہ وہ ایک متمول زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئیں جو اودھ ضلع بارہ بنکی یوپی انڈیا کے ایک قصبہ کھیوئی میں ہے قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی عمر میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے راولپنڈی پاکستان اقامت گزیں ہوئیں اور یہیں ہوش سنبھالا عدیل احمد صدیقی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد کراچی آگئیں کراچی میں مختصر قیام کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ ٹورنٹو کینیڈا چلی گئیں تادمِ تحریر وہیں قیام پذیر ہیں شذرہ ھذا میں ہم اُن کے مذکورہ مجموعہ کے سُدس اول کی منتخب غزلیات متذکرہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

اُن کے ہاں ایک عمیق وبسیط نوعیت کا احساسِ سپاس گزاری پایا جاتا ہے جو عبدیت کی عمدہ

دلیل ہے وہ بین السطور جگہ جگہ اُس ذاتِ اقدس کے لطف و کرم کا تذکرہ کرتی رہتی ہیں اُس منعمِ حقیقی کی انواع و اقسام کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد محوِ تشکر ہو جاتی ہیں جس سے اُن کے افکار کی تطہیر کا اندازہ ہوتا ہے اُن کی ایک حمد کے تین اشعار اسی تناظر میں زیبِ قرطاس ہیں۔

یہ تیرا شکر ہے احسان تیرا
کبھی آفات سے مجھ کو بچایا

مجھے شوہر دیا اولاد بھی دی
مرے آنگن کو بچوں سے سجایا

کروں میں شکر تیرا لحہ لحہ
مجھے اچھوں سے بھی اچھا بنایا

درخشاں صدیقی کے شعری مخزن میں ایک فزوں تر احساس فرمابرداری ملتا ہے اُن کا مناجاتی انداز سہلِ ممتنع کے پیرائے میں دل میں اُترتا ہوا محسوس ہوتا ہے احساس کی سچائی اور جذبوں کا رچاؤ ہے جو اُن کے اشعار میں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی نسبت سے اُن کی غزل چار اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

جھکائے رہیں سر ترے آگے ہم
کہ جب تک رہے جسم و جاں میں یہ دم

ہر اک سمت بے چینیوں کی فضا
کہ ہم شکر تیرا جو کرتے ہیں کم

شمار اپنے اُن نیک بندوں میں کر
ہمیشہ رہا جن پہ تیرا کرم

کرم ہم پہ آقا ترا ہو بہت

کبھی ہم پہ آئے نہ رنج و الم

وہ کائنات کو اپنی معرفت بیں نظر سے دیکھتی ہیں اس لیے سنسار کی ہر شے میں انھیں صانعِ عالم کے حسیں جلوے نظر آتے ہیں اندھیرے، اُجالے، شب و روز، شام و سحر فضاؤں، کہکشاؤں، فلک، ستاروں، قمر، گلستاں اور بیاباں میں انہیں ذاتِ حقیقی کے جلوے دکھائی دیتے ہیں بقول خواجہ میر درد۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

انہیں احساسات کی جلوہ سامانی اُن کی ایک غزل کے چار اشعار میں دیدنی ہے۔

ہر اک شے میں پیشِ نظر تو ہی تو ہے
جدھر میں نے دیکھا اُدھر تو ہی تو ہے
اندھیرا بھی تیرا اُجالا بھی تیرا
فضائیں بھی اور کہکشائیں بھی تیری
فلک اور ستارے قمر تو ہی تو ہے
گلستاں بھی تیرا بیاباں بھی تیرا
تو ہے معتبر نامور تو ہی تو ہے

ہمہ اوست کا فلسفہ ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے اس لیے وہ اپنی ذات سے ماورا ہو کر سوچتی ہیں اپنے ذاتی خصائص کو قدرت سے منسوب کرتی ہیں اُن کے ادراکات کائناتی نوعیت کے ہیں خالقِ کائنات کے اوصاف کی مدح سرائی بھرپور انداز میں ان کے ہاں جلوہ ریز ہو رہی ہے اُن کی ایک اور غزل کے چار اشعار لائقِ التفات ہیں۔

مری آن تو ہے مری شان تو ہے

مری جان تو میرا ایمان تو ہے

تو مالک و قادر تو خالق و رازق

تو ہے سب کا داتا نگہبان تو ہے

تو اعلیٰ و ارفع تو اول و آخر

ازل سے ابد تک کی پہچان تو ہے

سماعت میں میری بصارت میں میری

بہاروں میں تو ہے گلستان تو ہے

خالقِ ارض وسما کی ذات سے اُن کا شوق وشغف دیدنی ہے۔جس سے ان کی معرفت کی جھلک ملتی ہے۔ان کے کردار اور افکار کی تطہیر پر روشنی پڑتی ہے جس سے اُن کی جسمانی اور روحانی ریاضتیں اشکار ہوتی ہیں غزل کے دو اشعار قابل غور ہیں۔

پنجگانہ نماز گھر میں ترے

اچھا لگتا ہے آتے جاتے ہیں

جھک گئی ہے جبیں ترے در پر

ہر خطا اپنی بخشواتے ہیں

ہر کام میں انہیں قدرت کی مصلحتیں اور مقاصد نظر آتے ہیں ان کی سوچ مقصدیت امیز ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کی قائل ہیں اور ان کی تمام تر خامہ فرسائیاں بھی اسی حوالے سے ہیں اُن کی ایک اور غزل کے دو اشعار دامنِ دل تھام رہے ہیں۔

ہمیں زمین پہ اُتارا کوئی مقصد ہو گا

کیا ہے ہم کو گوارا کوئی مقصد ہو گا؟

خدائے برتر و بالا نے آزمائش میں

دیا ہے ساتھ ہمارا کوئی مقصد ہو گا

درخشاں صدیقی نے زیادہ تر مفرد اور رواں دواں بحور میں سخن سنجی کی ہے موسیقیت اور آہنگ اُن کے کلام کا امتیازی وصف ہے مذکورہ استخراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا اظہار معرفت بھر پور نوعیت کا ہے اگر اُن کی شعری ریاضت تسلسل سے جاری وساری رہی تو وہ عارفانہ اوراکات کی نئی شمعیں روشن کرتی چلی جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن ڈاٹ کام

درخشاںؔ صدیقی (کراچی)

مکاں میں رہتا کوئی نہیں ہے
ابھی یہ بستی بسی نہیں ہے

یہ گھر ہے کس کا ہے کون مالک؟
مکاں پہ تختی لگی نہیں ہے

وہ اپنے گھر سے چلا گیا ہے
یہاں ہے سب کچھ وہی نہیں ہے

تلاشِ منزل میں سرگراں ہیں
وہ جن کو منزل ملی نہیں ہے

نہ رات روشن نہ درخشاں صبح
تمہاری محفل سجی نہیں ہے

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

درخشاں صدیقی (کراچی)

کتنی مشکل ہے غم چھپانے میں؟
بات نکلتی ہے مسکرانے میں

اجنبی ہیں ترے دیار میں ہم
وقت لگتا ہے دل ملانے میں

لذتِ غم سے آشنا ہوں میں
اتنا آساں نہیں نبھانے میں

روٹھ جاتا ہے وہ کبھی تو ہمیں
دیر لگتی نہیں منانے میں

درخشاں لطف اب تو آتا ہے
مسکرا کر ستم اُٹھانے میں

رخشندہ نوید محبت کے موسموں کی شاعرہ

محبت ایک اقلیمِ الفت ہے جس کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور دلکش ہے محبت مختلف کیفیات و واردات سے مملو ہوتی ہے جنہیں اس کے موسموں سے عبارت کیا جاتا ہے ان موسموں میں ہجر و وصال ،مسرت و عسرت ،حیرت و استعجاب اور سوز و گداز وغیرہ شامل ہیں محبت کے موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ دنیا و مافیا کے تمام تر موضوعات اس میں سما سکتے ہیں اور یہ تمام تر موضوعات کا سرنامہ ہے باقی جذبات و احساسات ذیلی اور معاون نوعیت کے ہیں ان افکار سے مرصع شاعری ہر عہد میں اعتبار ذوق رہی ہے اور رہے گی یہ تخیلات ہر عہد میں افتخار زریں قرار پاتے ہیں اور ان کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ سمجھی جاتی ہے ایسی شاعری ہر رت میں سدا بہار اور تر و تازہ رہتی ہے اگر چہ جدید شعری رویوں میں محبت سے انحراف اور اختلاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید نکھر کر سامنے آئی ہے جس سے یہ استخراجی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ جواں جذبوں کی اہمیت سے انکار اور فرار ممکن نہیں ہے اکثر و بیشتر شاعرات کا کلام محبت کے حسین احساسات سے مزین ہوتا ہے جس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ نسائی شاعری میں داخلی اظہار بھر پور انداز میں پایا جاتا ہے محبت چوں کہ داخلی کیفیت کا نام ہے کیوں کہ محبت کی نمو انسان کے دروں سے ہوئی ہے اس لیے شاعرات کے ہاں رومان نگاری کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں شذرہ ھذا میں رخشندہ نوید کی شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں جو تمام تر محبت کے موسموں سے مسجع ہے ان کے تیسرے شعری مجموعے ”نیاں اتریں پار“ مطبوعہ 2009ء کے منتخب غزلیات کے اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شامل شذرہ کرتے ہیں مذکورہ مجموعہ کا نام جہاں محبت سے لبریز ہے وہاں دور اندیشی کا غماز بھی ہے

رخشندہ نوید کا بنیادی تعلق لاہور سے ہے پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے صحافت میں ایم اے کیا تعلیم و تعلم کے شعبہ سے منسلک ہیں تدریسی امور کا عمیق تجربہ رکھتی ہیں واضح رہے قبل ازیں انکے دو شعری مجموعے ''پھر وصال کیسے ہو'' مطبوعہ 2004ء اور ''کسی اور سے محبت'' مطبوعہ 2007ء قارئین شعر و سخن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

رخشندہ نوید کے کلام سے فکری بلوغت کے آثار نمو پاشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے ان کے افکار نادر الظیر اور رفعت تخیل کے حامل ہیں ان کی قوت متخیلہ جدت وندرت کی دولت سے مالا مال ہے ان کے تخیلات میں صنعتِ تضاد اور متضاد خیالات کا اہتمام خوبصورت قرینے سے ملتا ہے جس سے بیان کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے ان کی فکر ہمہ جہت اور ہمہ پہلو ہے اس لیے اس بیک وقت معرفت و مجاز دونوں پر مہمیز کیا جا سکتا ہے محبت کے حوالے سے ان کے شعری مخزن میں ایک طرح کی جزیات نگاری پائی جاتی ہے جہاں محبوب کے لطف و کرم کا تذکرہ ہے وہاں جور و جفا کا مذکور بھی ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کا مطلع اور ایک شعر لائق التفات ہے۔

اسی لیے تو سمجھ رہی ہوں اسے خدا بھی
قریب رہتا بھی ہے مرے مجھ سے جدا بھی

مرے مسیحا کی وجہ شہرت ستمگری ہے
وہ زخم کے ساتھ ساتھ دیتا رہا دوا بھی

ان کے ہاں محبت کے حوالے سے عمیق احساسات پائے جاتے ہیں جن میں ایک بے خودی ہے عالم جنوں ہے چاہت کا فسوں ہے کیف و سرور ہے جوش و جذبہ ہے سرخوشی اور سرمستی کی ایک فضا پائی جاتی ہے جس کے باعث ان کا طرز اظہار فطری نوعیت اختیار کر جاتا ہے جو بناوٹ، تصنع اور آورد کی آلائشوں سے مبرا و ماورا ہے بلکہ خالصتاً آمد کا انداز ہے جن میں محبت کی کیفیات کو سمو دیا گیا ہے۔

کیسے نکلوں خمار سے باہر؟

بازوؤں کے حصار سے باہر
چند لمحوں کی مختصر قربت
اور یادیں شمار سے باہر
اس لیے اس کی یاد میں گم ہوں
بھولنا اختیار سے باہر

روایت کی حسین پاسداری بھی ان کے کلام کا ایک وصف خاص ہے اسلوبیاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کا اسلوب سہل ممتنع کی ردا اوڑھے قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتا ہے۔

اک اک کر کے لوٹا دے گا میرا سب کچھ دیا ہوا
آپ بہت اچھی ہیں کہہ کر پہلا قرض اتارا ہے
عشق میں قتل روا ہوتا ہے لیکن میرے ستمگر نے
پانی جہاں نہیں تھا مجھ کو لا کر وہیں پہ مارا ہے

محبت کا بسیط احساس چاہت کے موسموں کی شدت وحدت کی غمازی کرتا ہے جس سے ساگر کی امواج میں تموج کی عکاسی ہوتی ہے شعر کے مختصر پیالے میں وہ اپنے موضوع کو دفعتاً سمیٹنے کا فن جانتی ہیں جس سے شعر میں کلائمکس اور تجسس پیدا ہوتا ہے ان کی یہی شعری پر اسراریت قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اسی حوالے سے ان کی ایک اور غزل کا مطلع در التفات پر دق الباب کر رہا ہے۔

شاخِ تن آپ کے شانوں میں حمائل ہوگی
ایک لمحے کو ہوا تک بھی نہ حائل ہوگی

وحشت الفت میں جہاں بے انت تنہائی ہے عالم ہجراں عالم شباب پر ہے جہاں وصل کا کوئی گماں تک نہیں محبوب کے رستے میں نینوں کے پھول بچھائے جب کوئی امید بر نہیں آتی تو پھر محب کو شدید نوعیت کی تکان کا احساس ہوتا ہے اسی فکر کی ترجمانی رخشندہ نوید کی زبانی دیکھتے ہیں۔

تمہاری راہ برسوں تک تکی ہوں
ان آنکھوں کی قسم اب تھک چکی ہوں

ان کے محبتوں کے موسموں معتدل نہیں ہیں بلکہ تغیر پذیر ہیں جہاں لمحہ بہ لمحہ انقلابات بپا ہوتے رہتے ہیں جن کے باعث افکار کی شدت وحدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مذکورہ اشتہادات کے علاوہ بھی بے شمار شعری تصریحات ہیں جو محبت کی مختلف کیفیات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں اسی تناظر میں کچھ شعری امثال بدون تبصرہ شعر و سخن کے متوالوں کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں۔

مجھ میں کچھ اور میرے سوا بھی تو ہے
معبدِ عشق میں اک خدا بھی تو ہے
انتظار ، انتظار ، انتظار آپ کا
ظلم ہے ظلم کی انتہا بھی تو ہے

☆

ایک یہ دل ہے کہ ترتیب میں آتا ہی نہیں
ایک اظہارِ محبت ہے جو بے ڈھنگ سا ہے

☆

تری یادوں کا دل میں اک خزانہ بن گیا
یہ ہم پیاسوں کی خاطر آب و دانہ بن گیا

☆

یہ خوئے بے نیازی وہ عمل پیرا ہے جس پر
یہ جاں لیوا تو ہے لیکن پسندیدہ ہے میری

☆

تو سامنے بیٹھا ہو ترا ساتھ بہت ہے

میرے لیے تو اتنی ملاقات بہت ہے

☆

تجھ سے ملنے کی جب مجھ کو جلدی لگی
پھر نہ گرمی لگی اور نہ سردی لگی

مذکورہ اقتباسات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ رخشندہ نوید کا کلام محبت کی عمیق کیفیات کا ترجمان ہے ایک اتھاہ سمندر ہے جس میں غواصی کے بعد قاری کے وجود کا خشک رہنا محال ہے قاری اس سرشاری سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جو بین السطور شعریت کی کومل لے کی صورت رقصاں نظر آتی ہے اور رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے بہر حال اگر ان کی شعری عرق ریزی تسلسل سے جادۂ منزل پہ گامزن رہی تو ان کے موضوعاتی کینوس میں بھی مزید وسعت کے شواہد اشکار ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید (لاہور)

ستم گروں سے عداوتیں کیا؟
انہی سے ان کی شکایتیں کیا؟

سفر کی دیکھیں تمازتیں کیا؟
نکل پڑیں تو نزاکتیں کیا؟

دلوں میں پچھلی کدورتیں ہیں
لبوں پہ ان کے حلاوتیں کیا؟

تُم جہاں کو سمیٹ کے رکھ
سخن میں ہوں گی ریاضتیں کیا؟

جب عقل پر پڑا ہے پردہ
بصیرتیں کیا، سماعتیں کیا؟

رموز جیون کے کھل نہ پائے
یہ روز و شب ہیں بجھارتیں کیا؟

رخشندہ نوید (لاہور)

سلسلوں کی ابتدا کو انتہا کرنا پڑا
چاہتوں میں ایک بت کو بھی خدا کرنا پڑا

بے رخی حد سے بڑھی لیکن یقیں آتا نہ تھا
دل کو سمجھانے کی خاطر حوصلہ کرنا پڑا

چند گھڑیاں باعثِ مرگِ محبت ہو گئیں
آخری ہچکی کو بھی حرفِ دعا کرنا پڑا

کیا سلیقے ڈھونڈتی اس سے بچھڑنے کی گھڑی؟
مجھ کو اپنے ہاتھ سے ناخن جدا کرنا پڑا

میرے جذبوں کی اُڑانیں دیکھ کر وہ ڈر گیا
تنگ آ کر صید کو اک دن رہا کرنا پڑا

ریحانہ روحؔی کے شعری تحیرات

تحیر و استفہام وہ بنیادی تلازمات ہیں جن سے علم و ادب کے ابواب واہوتے ہیں جس تخلیق کار کے ہاں یہ عوامل بکثرت ہوں گے وہ عمیق ادراکات کا حامل ہوگا استفہامیہ او رتحیراتی عمل ایک ایسا سمندر ہے جس میں غوطہ زنی کے بعد انسانی علم وفن کی نمو ہوتی ہے بقول راقم الحروف بحوالہ نظم ''راز نمو''

فن ہے اَن سمندر
پہلے ڈوبو
پھر نکلو گے

گویا تحیر وہ کلیدی تلازمہ ہے جو شعور وآگہی کے قصر کی خشتِ اول قرار پاتا ہے جس پر افکار و تخیلات کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے ہم نے جب ریحانہ روحؔی کے کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو ہمیں ان کے شعری مخزن میں دولتِ تحیر فزوں تر نظر آئی ان کے شعری مجموعہ ''عشق زاد'' کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں کتاب ھذا کی اشاعت جنوری 2000ء میں عمل میں آئی ان کا تعلق کراچی سے ہے کچھ عرصہ سعودی عرب میں بھی مقیم رہیں۔

اُن کی قوت متخیلہ پر تجسس نوعیت کی حامل ہے اس لیے ان کے تخیلات میں استفسارات کی ایک وسیع وعریض دنیا آباد ہے انہیں ہر گام پر طرح طرح کے سوالات جھائی دیتے ہیں جن کے جوابات کی وہ متلاشی نظر آتی ہیں وہ دنیا کی رنگا رنگی سے مرغوب نہیں ہوتیں بلکہ اس کی بے ثباتی کا

اظہار ان کے ہاں برملا انداز میں ملتا ہے ان کے ہاں جنون وخرد کے حوالے سے عمیق خیالات ملتے ہیں ان کے ہاں نادر الخطیر ترکیبات قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتی ہیں جس سے ان کے بیان میں جدت وجاذبیت کے مظاہر جلوہ ریز ہوئے ہیں اسلوب کی چاشنی بھی ہے اور عمدہ درجے کی مضمون آفرینی بھی ہے عروضی اعتبار سے انہوں نے زیادہ تر مفرد اور رواں دواں بحور میں لکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص رنگ کا آہنگ اور موسیقیت آشکار ہوئی ہے اسلوبیاتی حوالے سے ایک شان دل آویزی ہے جو ان کی متنوع شعری طبع اور جودت طبع کی غمازی کرتی ہے ان کی ایک پوری غزل دنیا ئے شعر وسخن کے متوالوں کی نذر ہے ۔

یہ دنیا مان لو جادو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
تماشا سا جو ہر اک سو ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟
سنا ہے کچھ دنوں میں خشک ہو جائے گی کشتِ دل
ابھی تو آنکھ میں آنسو ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟
گھنا جنگل جہاں چوبیس گھنٹے رات رہتی ہے
وہاں فی الحال تو جگنو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
کھلے صحرا میں جب تک سر پہ سورج آ نہیں سکتا
جبھی تک پیاس پر قابو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
غنیمت ہے کہ اس آشوبِ ہجرت میں ابھی کچھ دن
ہماری ہمرہی میں تو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
محبت ماقبلِ ہستی میں مثلِ مشک ہے جب تک
جبھی تک زندگی خوشبو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
کوئی تو حد ہے جس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا
سراب جو ہے بشرط ہو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
دلِ وحشی کی سیمابی کے صدقے اب تلک روتی

رمیدہ دشت میں آہو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟

حیات انسانی طرح طرح کے خدشات سے دو چار ہے اور ہر گام ایک نئے جوکھم سے ہمکنار ہے اسی صورت احوال نے بنی نوع انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے چاہے جنوں کی دنیا ہو یا خرد کی خطرات ہمہ گیر حیثیت رکھتے ہیں دل کی دنیا نسبتاً زیادہ پر خطر ہوتی ہے اسی پر کٹھن کیفیت کی غمازی ریحانہ روحی کی غزل کے مطلع میں دیکھتے ہیں۔

دل کو رہ رہ کے یہ اندیشے ڈرانے لگ جائیں
واپسی میں اسے ممکن ہے زمانے لگ جائیں

فکری تغیرات شعری تحیرات کی عمدہ تمثیل ہوتے ہیں وسیع پیانے پر تغیراتی عمل افکار کی ندرت پر دلالت کرتا ہے ریحانہ روحی کے ہاں بھی تحیراتی اور تغیراتی عوامل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اسی حوالے سے ان کی غزل کے تین اشعار دیدنی ہیں۔

غرورِ فتح میں مت بھولنا کہ دوسری سمت
غنیم دستہ بدلنے کے فن سے واقف ہے
عجیب تجربہ گزرا کہ دشتِ غربت میں
شجر بھی سایہ بدلنے کے فن سے واقف ہے
ہوئی چشمِ شناسا بھی اجنبی تو کھلا
کہ آنکھ رشتہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

ان کے کلام میں دولت تحیر کے ساتھ ساتھ ایک غور و خوض کا عمل ملتا ہے جو ایک حیران کن کیفیت خود میں سموئے ہوئے ہے وہ حیات کے معنائی پہلو کو زیر غور لاتی ہیں جس سے ان کی پر تجسس شعری طبع کی عکاسی ہوتی ہے وہ زیست کے ہر پہلو کو سوچتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اسی نسبت سے ان کی غزل کے تین اشعار زیب قرطاس ہیں۔

میں اپنی آنکھ میں جب اس کے خواب دیکھتی ہوں

تو خوشبوؤں سے چمکتے گلاب سوچتی ہوں
وہ سب سوال جو میری سمجھ سے باہر ہیں
میں جاگ جاگ کے ان کے جواب سوچتی ہوں
پلٹ کے دیکھتی ہوں جب رہِ وفا کی طرف
تو عمر بھر کے دکھوں کا حساب سوچتی ہوں

ریحانہ روحی کی شعری پراسراریت قاری کو حیرت واستعجاب کی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں انسان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا یہ اعجاز وافتخار ان کے شعری تجربات کی بدولت ہے انہوں نے زیست کی حیرتوں کو شعری پیرہن عطا کیا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

دوراہے پر کھڑی ہوئی یہ سوچتی ہوں میں
راہِ اماں کدھر ہے کدھر جانا چاہیے

اُن کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں حیرت اپنی انتہا پر دکھائی دیتی ہے ان کا استعجابی انداز قابلِ ستائش ہے ایسے ہی افکار بہت کم شاعرات کے ہاں پائے جاتے ہیں زیست کی حیرتوں کا احاطہ کرنا بھی قابلِ حیرت امر ہے ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

اے مصور آنکھ کی تصویر میں
کسی طرح حیرت اُتاری جائے گی

ریحانہ روحی کے کلام کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ہاں حیرت واستعجاب کا ایک جہان آباد ہے جو ان کی مقبولیت وپذیرائی کا جواز پیش کرتا ہے مزید شعری ریاضت ان کے لیے فزوں تر فکری وفنی بالیدگی کا باعث بنے گی جس کے باعث ان کے آدرش میں وسعت پیدا ہوگی اور وہ اپنے ادبی مقام ومرتبے کو بہتر انداز میں اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

ریحانہ روحی (کراچی)

کائنات اور آسمان کے درمیان ہوتا ہے کیا؟
کچھ نہیں ہوتا جہاں آخر وہاں ہوتا ہے کیا؟

جب چراغِ آرزو جلتا ہو دل کے طاق میں
کوئی کیا جانے کہ وہ روشن سماں ہوتا ہے کیا؟

فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا جب لوح پر
پھر ہماری قسمتوں کا امتحاں ہوتا ہے کیا؟

شہر والو! تم نے دیکھی ہیں مری بربادیاں
سچ بتاؤ کوئی یوں بے خانماں ہوتا ہے کیا؟

ایک ہی تو شخص ہوتا ہے بھرے سنسار میں
وہ نہیں ہوتا تو جانے پھر کہاں ہوتا ہے کیا؟

گھونسلہ جس کا اٹھا کر لے گئے بچے شریر
کوئی اس چڑیا سے پوچھے آشیاں ہوتا ہے کیا؟

آج جو کچھ سامنے ہے بس حقیقت ہے یہی
ورنہ روحی کون جانے کل یہاں ہوتا ہے کیا؟

ریحانہ روحی (کراچی)

عجب حادثہ تھا قیامت گھڑی تھی
بچھڑنا کڑے امتحاں کی کڑی تھی

وہ عورت بھی آخر کو گھر دار نکلی
میں جس کے لیے سارے گھر سے لڑی تھی

وہ جب آسماں میرے شانوں سے پھسلا
زمیں اپنے محور پہ ساکت کھڑی تھی

میں جس وقت بیٹی سے ماں بن رہی تھی
میں اس وقت سارے جہاں سے بڑی تھی

ابھی جس کو جی بھر کے دیکھا نہیں تھا
اُسے دور جانے کی جلدی پڑی تھی

وہ خائف تھا مختار ہوتے ہوئے بھی
میں محکوم ہو کر بھی ضد پر اڑی تھی

مرا دل محبت کا مندر تھا روحی
سو محلوں سے برتر مری جھونپڑی تھی

ریحانہ قمر کی فکری نادرہ کاریاں

تخیلات کی جدت وندرت، طرفگی، قرینہ کاری، تازہ کاری اور کرشمہ کاری نادرہ کاری سے عبارت ہے جب کسی شاعر کے ہاں فکری وفنی بالیدگی کے مظاہر آشکار ہوتے ہیں جب اس کے زبان وبیان اور اسلوب میں پختگی کے شواہد ہویدا ہوتے ہیں جب اس کی سوچ کے زاویے نجی، عمومی اور روایتی سطح سے ہٹ کر ہوتے ہیں تو اس کا کلام فکری نادرہ کاری کا سرچشمہ قرار پاتا ہے آج ہمارے زیرِ نظر ریحانہ قمر کا شعری مجموعہ ''مگر تم اپنا خیال رکھنا'' ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ان کی فکری نادرہ کاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں ہمارے سامنے نادرالنظیر خیالات کا ایک جہانِ غنیر ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ریحانہ قمر کا کلام فکری ندرت کا ایک گراں بہا مخزن ہے جو بے پناہ دلکشی کا حامل ہے مذکورہ مجموعہ کے تقریباً ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ شاملِ شذرہ کرتے ہیں کتاب ھٰذا کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اب تک اس کے پانچ ایڈیشن زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں اس کی آخری بار اشاعت اکتوبر 2003ء میں ہوئی۔

عصرِ حاضر میں بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں حیاتِ انسانی فکری انقلاب سے ہم آغوش ہوئی جہاں زندگی کے دیگر شعبوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے وہاں نئی شعر گوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا فکری اعتبار سے دورِ حیرت انگیز تبدیلیاں یوں آئیں جن کی مثال سابقہ شعری تاریخ میں نہیں ملتی اولاً یہ تبدیلی ہوئی کہ تنقیدی رویوں کو فروغ میسر ہوا یہ تغیر اجتماعی انداز

میں سامنے آیا ہے جبکہ دوسری تبدیلی جس کا اقلیم شعر کی سابقہ تاریخ میں تصور کیا جانا بھی محالات میں سے ہے وہ رومانوی حوالے سے تنقیدی رویئوں کا سامنے آنا ہے جس نے رومانویت کو قدیم و جدید کے درجوں میں منقسم کردیا ہے یا اعجاز حیرت و استعجاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مصلحت پسندی سامنے آئی ہے جسے انسان کی خرد پسندی سے تعبیر کیا گیا ہے یوں دنیائے جنوں میں خرد کے عمل دخل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا ہے جس نے متنوع موضوعات کو جنم دیا اسی پس منظر میں ریحانہ قمر کی غزل کے تین اشعار لائق اعتنا ہیں۔

محبت سے مکر جانا ضروری ہو گیا تھا
پلٹ کر اپنے گھر جانا ضروری ہوگیا تھا
نظر انداز کرنے کی سزا دینی تھی تجھ کو
ترے دل میں اتر جانا ضروری ہوگیا تھا
میں سناٹے کی جنگ سے بہت ہی تنگ آئی تھی
کسی آواز پر جانا ضروری ہو گیا تھا

دولتِ ضبط کی بازیافت انسان کی بہت بڑی کامیابی ہوا کرتی ہے عشق اور ضبط دوایسے اوصاف ہیں جو رازداری سے ہم آغوش نہیں ہو سکتے آنکھیں عشق کا تمام فسانہ طشت ازبام کردیتی ہیں جب کہ چہرے کے دیگر نقوش ضبط کا بھید چھپانے سے قاصر ہوتے ہیں دنیائے جنوں میں محبوب کا غم ہی محبّ کی اداسی کا سبب بنتا ہے جس کے باعث رازدار احباب محبّ سے محبوب کی احوال پرسی بھی کرتے ہیں انسانی زندگی میں خوشی کا معدوم ہونا بھی غم کی علامت متصور ہوئی ہے جس کے سبب انسان شاکی و ملال نظر آتا ہے یہ تمام فکری نادرہ کاری کے شواہد ہیں جو ریحانہ قمر کی ایک غزل کے تین اشعار میں جلوہ ریزیاں کررہے ہیں۔

بجے ہیں اشک نہ ابھری ہیں سسکیاں میری
ہوا سناتی پھری ہے کہانیاں میری

میری اُداسی کا جب بھی انہیں ہوا معلوم
تمہارا پوچھنے آئیں سہیلیاں میری
نہ کوئی پینگ پڑی ہے نہ پھول آئے ہیں
بہت اُداس ہیں کچھ دن سے ٹہنیاں میری

ریحانہ قمر کے ہاں مزاحمتی رویے بھی پورے اہتمام کے ساتھ جلوہ نما نظر آتے ہیں اُن کا اسلوب سہلِ ممتنع کے رنگ کا حامل ہے سادہ اور سہل نگاری کی ایک خوبصورت روایت ان کے ہاں ملتی ہے۔

سہہ نہ پایا وہ سچ محبت کا
اس نے میری زبان کٹوا دی
جانے کیوں اس کے سامنے جا کر؟
گنگ ہو تے ہیں اس کے فریادی

اُن کے بات کرنے کا رنگ ڈھنگ جداگانہ اور منفرد نوعیت کا ہے تخیل کی اُڑان بہت اعلیٰ و ارفع ہے کہیں کہیں ان کے تخیلات میں بےخودی اور گومگوئی کیفیت مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

گھر سے باہر تھی نہ گھر بیٹھی رہی
سوچ کی دہلیز پر بیٹھی رہی

رومانوی جذبات و احساسات بھی نادر النظیر انداز میں ان کے شعری مخزن کا حصہ ہیں انہوں نے شعری اظہار کے لیے فکر کے عمومی رستوں کو جادۂ منزل نہیں بنایا بلکہ جدت و ندرت کی طرف گام بڑھایا ہے۔

ابھی پوری طرح دل سے نہیں نکلا خیال اس کا
ابھی تھوڑی بہت میں زندگی محسوس کرتی ہوں

اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں عروضی تلازمات کا اہتمام بخوبی ملتا ہے انہوں

نے زیادہ تر مرکب بحور میں طبع آزمائی کی ہے جن میں آہنگ اور موسیقیت بھی ہے مضمون آفرینی بھی ہے اسلوب جاذبیت سے مملو ہے متذکرہ تصریحات شاہد ہیں کہ ریحانہ قمر کا کلام فکری نیرنگیوں اور نادرہ کاری سے عبارت ہے جس میں تازہ کاری کی ایک بھرپور لہر موجود ہے مزید فکری و فنی معیارات کی بازیافت کے لیے انہیں فزوں تر ریاضت کے جاں گداز عمل سے گزرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

ریحانہ قمر (لاہور)

انگلیاں پھیر رہا تھا وہ خیالوں میں کہیں
لمس محسوس ہوا ہے میرے بالوں میں کہیں

اب میرا ساتھ نہیں دیتا پیادہ دل کا
ہار جاؤں نہ میں آ کر تری چالوں میں کہیں

اس تشخص پر بھی رہتا ہے یہ دھڑکا دل کا
کھو نہ جاؤں میں تیرے چاہنے والوں میں کہیں

ایک سورج نے مجھے چاند کا رتبہ بخشا
ورنہ ہوتی میں کتابوں کے حوالوں میں کہیں

مجھ کو لگتا تو ہیں وہ متزلزل لیکن
اس کو وحشت ہی نہ لے جائے غزالوں میں کہیں

ریحانہ قمر (لاہور)

خدا کی ذات پہ ہے اس قدر یقین مجھے
کبھی مٹا نہ سکیں گے مخالفین مجھے

سب اپنی اپنی غلط فہمیوں میں زندہ رہیں
خدا کرے نہ سمجھ پائیں حاسدین مجھے

وطن سے آتے ہوئے میں نے یہ نہ سوچا تھا
کہ تہمتوں سے نوازے گی یہ زمین مجھے

کبھی کبھی تو مجھے اس طرح سے ملتا ہے
ترے خلوص پہ آتا نہیں یقین مجھے

میں تلخ ہوں تو مجھے تلخ رہنے دیں وہ قمر
نہ اپنی سطح پر لائیں منافقین مجھے

زیب النساء زیبؔی کے بیتِ حزن

غم ایک لازوال اور فطری جذبہ ہے جو نیا فکار کم و بیش ہر شاعر اور شاعرہ کے شعری شعور کا حصہ ہوتے ہیں غم و الم سے عبارت کلام ہر عہد اور ہر رت میں ہر دلعزیز اور مقبول رہتا ہے حزن و ملال سے منسوب شاعری تا دیر زندہ رہتی ہے اور اس کے اثرات دیر پا ہوتے ہیں جس طرح ہر تخلیق کار اپنے سماج کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے اس کے تخلیق کردہ ادب میں بھی ایک سماجی کرب پنہاں ہوتا ہے اسی طرح ایک شاعرہ بھی اپنی معاشرت کی عکاس ہوتی ہے۔ معاشرے کے دکھ درد کا بیان اس کی قوتِ متخیلہ کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک شاعرہ صنف نازک ہونے کی وجہ سے زیادہ حساس ہوتی ہے اس لیے اس کے سخن میں اس کے ذاتی مصائب و آلام کے ساتھ ایک سماجی کرب بھی شامل ہوتا ہے زیب النساء زیبؔی کے کلام میں بھی حزنیہ جذبات و احساسات وفور سے پائے جاتے ہیں جن میں کچھ حوالے ذاتی نوعیت کے ہیں تو کچھ اجتماعی۔ ذات سے لے کر کائنات تک ایک طویل مسافت ہے غم کے کئی روپ ہیں جن میں غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غم ذات شامل ہیں اس شذرے میں ہم ان کے حزنیہ تخیلات کی نسبت سے رقم طراز ہیں ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''دل میں ہیں آپ'' کے منتخب غزلیہ اشعار شاملِ تجزیہ ہیں۔

جب طبیعت غموں کی اسیر ہو جاتی ہے۔ جب مزاج پر الم کی حکمرانی ہو تو خوشیاں بھی حزن و ملال کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہیں پھر انسان یاسیت و قنوطیت پسند ہو جاتا ہے پھر ہر سو مصائب و آلام کے مناظر مہیب لگتے ہیں جب ہر جانب نفسانفسی کا دور دورہ ہو تو پھر زندگی کرنا مشکل ہو جاتا ہے

ایسی صورت احوال میں انسان کا شہناز مرگ کو خوش آمدید کہنے کو جی کرتا ہے اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

آج پھر خوب مسکرائے ہم
ایک خبر غم کی کوئی آنی ہے
دیکھ کر کیا کہیں زمانے کو؟
اب تو مرنے کی ہم نے ٹھانی ہے

غم کے ذاتی حوالوں کی نسبت ان کے ہاں اجتماعی حوالے وفور سے پائے جاتے ہیں وہ اپنی ذات کی نمائندگی کی بجائے اپنے سماج کی ترجمانی کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں ان کے ہاں ایک عصری کرب ہے جو نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے جس میں ہر غم کی کہانی ہے غمِ معاش کی بپتا بھی ہے اور احساسِ تنہائی بھی شدید نوعیت کا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ہر قلب میں غموں کا سمندر ہے موجزن
اپنے ہی غم میں ہر کوئی ڈوبا دکھائی دے
فکرِ معاش کا وہ بھیانک عذاب ہے
ہر شخص خودکشی کا سراپا دکھائی دے
کہنے کو ہر طرف ہے بھرے شہر کا سماں
دل ہے کہ اس ہجوم میں تنہا دکھائی دے

ان کی تزئینِ طرزِ فکر کی حامل ایک غزل بدونِ تبصرہ زیبِ قرطاس ہے۔

فکر کیا آ گئی اگر باری؟
کر چکے ہم بھی اپنی تیاری
ان کے لفظوں کی تھی گراں باری
جس کا رد عمل ہے بیزاری

اور دیتے ہیں زخم دل کو ہوا
غم گساری بھی اک ہے مکاری
اپنے غیروں کی طرح ملتے ہیں
اب کہاں باہمی روا داری؟
سامنے آ کے اس نے وار کیا
وہ بھلا بیٹھا رسم وفا داری
سچ بھی اک جرم ہے کہ اپنے بھی
اب نہیں آفادۂ دل آزاری
وہ رہا ساتھ اجنبی کی طرح
عمر تنہا گزر گئی ساری
ساتھ دونوں ہیں بےضرورت کیوں؟
ساتھ دینا بھی ہو گیا بھاری
دوستی نام ہے خسارے کا
اب کہاں جذبۂ وفا داری؟
کیوں گماں ہو تری محبت کا؟
یہ محبت ہے یا ہے فنکاری
دوست عنقا ہیں زیبی دنیا میں
کوئی کرتا نہیں ہے غم خواری

ان کے ہاں صرف ذات کا ادراک ہی نہیں وہ اپنے اردگرد کے مصائب و آلام کو بھی موضوع سخن بناتی ہیں جہاں کی بےچینی اور اضطراب ان کے مشاہدات کا حصہ ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کا مطلع لائق توجہ ہے۔

بے رنگ سے جو چہرے ہیں کو بہ کو
تلخی کوئی سماج میں ابھری ہے چار سو

ان کا کرب وسوز سماجی روئیوں کی غمازی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ان کا درد وغم عمومیت کا مظہر بھی ہے اور سماج کے دوسرے معائب کی بھی عکاسی کرتا ہے انہیں جب خلوص و وفا کا قحط نظر آتا ہے تو پھر وہ مجبور نوا ہو جاتی ہیں۔

یہ بھولی بھالی جو صورتیں ہیں
دلوں میں پنہاں عداوتیں ہیں
کسے کہیں اپنا کس کو چاہیں؟
کہ دل میں سب کے کدورتیں ہیں

زیب النساء زیبی کے تخیلات سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے ہاں حزن و ملال کا سرمایہ وافر ہے یہی غم والم ان کے شعری شعور کو مزید تحریک دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

زیب النساء زیبیؔ (کراچی)

امیرِ شہر نے تانی ہیں اپنی شمشیریں
کہ اہلِ فن کے لیے بن رہی ہیں زنجیریں

ہمارے پاس نہ سرمایہ اور نہ جاگیریں
ہمارے پاس ہیں ، خوابوں کی صرف تعبیریں

ہوا کے رخ پہ جو دوڑیں وہ راج کرتے ہیں
کبھی بدلتی نہیں اہلِ حق کی تقدیریں

ہمارے بچے ہی سچائی کی علامت ہیں
کہاں ملیں گی یہ معصومیت کی تصویریں؟

جو اہلِ فن ہیں انہیں دوستو! سلام کرو
ہیں ان کے پاس ہنر مندوں کی جاگیریں

یزیدِ وقت کی بیعت بھی کیوں کریں زیبیؔ
ہمیں قبول ہیں ظلم و ستم کی زنجیریں

وہ خواب دیکھیے زیبیؔ کہ جن کا حاصل ہوں
سدا بہار خلوص و وفا کی تعبیریں

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

زیب النساء زیبی (کراچی)

کبھی جو تم سے ملاقات ہوگئی ہوتی
تو تیز دھوپ میں برسات ہوگئی ہوتی

جو ساتھ ان کے مری ذات ہوگئی ہوتی
نگاہِ شوق بھی سوغات ہوگئی ہوتی

شکست و ریخت سے میں بھی اگر گزر جاتی
تو کامیاب مری ذات ہوگئی ہوتی

غموں سے دل بھی اگر میرا بھر گیا ہوتا
تو آنسوؤں کی بھی برسات ہوگئی ہوتی

ذرا سی دیر بھی زیبی جو ان سے مل سکتے
خوشی ہی زیست کی سوغات ہوگئی ہوتی

سیمیں برلاس اور عصری رویے

کسی بھی سخنور کی کامیابی کا راز اس امر میں مضمر ہوتا ہے کہ اُس کے سخن میں اپنے عہد کی ترجمانی کس حد تک پائی جاتی ہے اور اس کے ہاں عصری رویّوں کا اظہار کس قدر ہے عصرِ حاضر میں جہاں بہت سی شاعرات اپنی شعری صلاحیتوں کو چند روایتی رومانوی تخیلات کی نذر کر رہی ہیں وہاں معدودے چند شاعرات ایسی بھی ہیں جن کے ہاں زمانی تقاضوں اور عصری رویّوں کا بھرپور اہتمام ملتا ہے جو ایک مستحسن قدر ہے ایسی معتبر ہستیوں میں ایک نام سیمیں برلاس کا ہے جن کا اصل نام نور الصباح برلاس ہے ان کے والد معظم برلاس پیشہ کے اعتبار سے بینکر ہیں تبادلوں کے باعث انہیں پاکستان کے مختلف شہروں میں اقامت پذیر ہونا پڑا سیمیں برلاس کو بھی اپنے تعلیمی مراحل کوئٹہ، حیدرآباد، راولپنڈی اور کراچی میں مکمل کرنا پڑے انہوں نے میڈیکل کے شعبے میں فزیوتھراپی کے شعبے کو منتخب کیا اور مختلف ہسپتالوں میں خدمات سرانجام دیں جنوری 1982ء میں ابوظہبی آرتھوپیڈک ہسپتال نے ان کی خدمات مستعار لیں تادمِ تحریر وہیں مصروفِ خدمت ہیں شذرہ ھٰذا میں ہم اُن کے شعری مجموعہ ''ندا'' مطبوعہ فروری 1983ء کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتے ہیں کتاب ھٰذا کے حوالے سے درخشاں برلاس کیف بنارسی محسن بھوپالی اور جون ایلیا جیسی جلیل القدر شخصیات کی گراں قدر آرا مثبت ہیں مجموعہ ھٰذا میں غزلیات، پابند اور آزاد نظمیات شامل ہیں۔

عصری بے مروتی کا مذکور اُن کے ہاں بھرپور انداز میں ملتا ہے جس کے باعث وہ عمرانی

روئیوں کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں خلوص و مروّت امن و آشتی کا آدرش اُن کے فکری کینوس سے جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ نفسا نفسی کے اس پر آشوب عہد میں محبتوں کی امین ہیں یہی امر اُن کے لیے فردِ جرم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے باعث ان کی حیات کٹھنائیوں سے عبارت ہو گئی اور اہلِ جہاں مائل بہ احتراز نظر آئے بقول ابو البیان ظہور احمد فاتح ۔

ہم پڑھاتے رہے ہیں کتابِ وفا
ہر جفا کار ہم سے خفا رہ گیا

بقول راقم الحروف ۔

اے خدا کس دیس میں ہم آ گئے؟
پیار عنقا ہے جہاں نفرت فزوں

اسی احساسِ فکر کی ترجمانی یمینؔ برلاس کی ایک غزل کے مطلع میں ملاحظہ کریں ۔

بھنور میں چھوڑ گئے ساتھ سب سہارے بھی
کنارہ کرنے لگے ہم سے یہ کنارے بھی

عصری چیرہ دستیوں کے شواہد شدت وحدت کے ساتھ اُن کے مشاہدات کا حصہ ہیں اس لیے اُن کے افکار میں حزن و ملال اور یاسیت و قنوطیت کا رنگ پایا جاتا ہے جس کی شدت قاری کو اپنے حصار میں لینے لگتی ہے اُن کے لیے چارہ جو یا چارہ گر یا مسیحا نفس کی بازیافت محالات کا حصہ ہے شومئی قسمت کے باوجود بھی فریبِ قلب جینے کی ایک نئی شکتی دیتا ہے مگر چاہتوں اور الفتوں کی جگہ انا کا براجمان ہونا اعلیٰ اخلاقی اقدار کی زبوں حالی کا شاخسانہ ہے اُن کے ہاں جہاں بے ثباتیٔ حیات ایک لمحۂ فکریہ ہے وہاں ایک رجا کا پیغام بھی ہے مصائب و آلام سے رستگاری کی نوید بھی ہے اسی تناظر میں اُن کی غزل کے چار اشعار زیبِ قرطاس ہیں ۔

سر پہ ہے دھوپ اور کہیں سائباں نہیں
رستہ کٹھن ہے اور کوئی مہرباں نہیں

گو بار ہا نصیب نے دھوکہ دیا ہمیں
خوش فہم دل ہے ایسا بھی بد گماں نہیں
خود داریاں بڑھیں تو بڑھے اور فاصلے
اب سلسلہ سلام کا بھی درمیاں نہیں
پل بھر قیام کرکے مسافر چلے گئے
اب گرد کارواں ہے مگر کارواں نہیں

اجتماعی احساس جرم نے وہ مہیب صورت اختیار کی ہے کہ احساس فوقیت جاتا رہا اور انسان کو عدالت دروں میں عقوبت خیز زیست بسر کرنی پڑی جب چار سو جرم کی گہما گہمی ہو ہر طرف ظلم کی حکمرانی ہو پھر معاملہ سیاہ سا ہو کر رہ جاتا ہے پھر ایسے میں فقط فرد واحد لائق سزا نہیں رہتا پھر پورا سماج سزاوار عقوبت ہو جاتا ہے اسی کشاکش کا مظہر ان کی غزل کا یہ شعر لائق التفات ہے۔

یہاں تو سارے مجرم ہیں کسے سنگسار کرتا ہے؟
اٹھا کر ہاتھ میں سب لوگ پتھر بھول جاتے ہیں

میکانی طرز حیات نے جہاں حیات انسانی کو بہت سی میکانی سہولیات فیضانات سے نوازا ہے وہاں اخلاقی اقدار کی پامالی کا سبب بھی بنی ہیں جس سے بہت سے نفسیاتی مسائل اجاگر ہوئے ہیں اخلاق و مروت سے عاری ہو کر انسان مشین کا ایک بے جان پرزہ بن کر رہ گیا جو اپنی ذات میں آزاد نہیں بلکہ اجتماعی میکانی عمل کے نتیجے میں متحرک ہوتا ہے جس کے باعث عصر حاضر کا جدید انسان شدید قسم کے احساس تنہائی میں مبتلا ہے اور یہ ابتلا کسی سماجی سانحے سے کم نہیں اس لیے انسان زیست اور مشیت سے شاکی اور نالاں نظر آتا ہے اس حوالے سے اُن کی غزل کے دو اشعار اقلیم قلب و خرد پر دق الباب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اب پاس نہیں کوئی شناسا کوئی ہمدم
اک زخم شناسائی کی تقدیر ہوا ہے

دل ہے کہ یہ پہلو میں کوئی پھانس چبھی ہے
ہر سانس کہ چلتی ہوئی شمشیر ہوا ہے

حزنیہ شعری طبع جہاں اُن کے فکری کینوس پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہاں اُن کے ہاں رجائی حوالے زندگی کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں اُن کے شعری مخزن میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں آس کی شمعیں جگمگا رہی ہیں اور زندہ رہنے کی جسارتیں مصمم عزائم کے ساتھ جلوہ ریز ہو رہی ہیں ایسے تخیلات عصری مقتضیات کا حصہ ہیں اُن کے آدرش میں ایک دعوتِ غور و خوض اور فکر و عمل ہے جس کے باعث نبضِ حیات تپش آمادہ رہتی ہے اُن کے اس قبیل کے اشعار ذیل کی تمثیلات میں دیدنی ہیں۔

میرا وجود مٹانے سے مٹ نہیں سکتا
مٹائے لاکھ زمانہ مجھے مٹانے کو
فلک کبھی میری قسمت بدل نہیں سکتا
میرا عمل ہے مری زندگی بنانے کو
کلفتوں سے ڈر کے ہمت ہارنا کیا چیز ہے؟
زندگی ہے بڑھ کے ہر طوفاں سے ٹکرانے کا نام
غور کیجیے تو یگانہ ہے نہ بیگانہ کوئی
پیار ہے سارے جہاں کے درد اپنانے کا نام

متذکرہ تصریحات شاہد ہیں کہ تبسم بزلاس کے کلام میں زمانی رجحانات، امکانی مقتضیات، ادراکِ زیست اور عصری رویوں کا عمیق و بسیط شعور کارفرما ہے یہ امر انتہائی خوش آیند ہے کہ دیگر ہم عصر سخنوروں کی طرح انہوں نے عمومی احساسات کو جادۂ منزل نہیں بنایا بلکہ فرسودہ تخیلات کی تردید کی ہے مزید شعری ریاضت اُن کے فکر و فن کو فزوں تر جاذبیت سے ہم آغوش کرنے میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔

سیمیں برلاس (کراچی)

کچھ منتشر سی سوچیں کچھ خواب ٹوٹے پھوٹے
اپنے سفر میں راہی تارے بھی نکلے جھوٹے

آنکھیں اُداس ہیں پر چہرے پہ ہے تبسم
اے چاند تونے دیکھا سکھ ہم نے کتنے لوٹے؟

خاموش ہوں تو کیسے شکوہ کریں تو کیوں کر؟
خوشیوں کے سب خزانے اپنوں نے ہم سے لوٹے

اک آس کے سہارے جی تو لیے ہیں ورنہ
ہم جانتے تو تھے ہی سپنے ہیں سارے جھوٹے

یوں تو یہاں ہیں سیمیں ہمدرد سب ہی لیکن
لفظوں میں ہے بناوٹ وعدے ہیں ان کے جھوٹے

سیمیں برلاس (کراچی)

پھول کھلے نہ بادل برسے
ساون کے دن آئے عبث

زخم جگر تو بھر گئے کب کے؟
مرہم تم اب لائے عبث

پتھر لوگ ہیں کانچ کے گھر میں
ایسے شہر بسائے عبث

اندھی نگری چوپٹ راج
اس جگ میں ہم آئے عبث

جو بے حس ہیں سیمیں ان کو
آئینہ تو دکھلائے عبث

سحؔر علی کی شانِ معاملہ بندی

اقلیمِ شعر و سخن کے حوالے سے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے شعری مخزن میں صنائع بدائع اور رموز و وقائع معدوم ہوتے جا رہے ہیں جبکہ متقدمین و متوسطین انہیں فنِ شاعری کا جوہر گردانتے تھے اس لیے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی شعراء کے ہاں ان کا اہتمام باضابطہ طور پر نظر آتا ہے اس لیے ان کی شعری مقبولیت اور پسندگی میں ان اسباب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے انہیں صنائع بدائع میں ایک صنعت معاملہ بندی بھی ہے معاملہ بندی سے مراد محبوب کے حوالے سے بات چیت اور چھیڑ چھاڑ کے پہلو بہ پہلو اُسے زچ کرنے کے امور بھی شامل ہیں علاوہ ازیں صاف گوئی کو بروئے کار لاتے ہوئے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دینا بھی اس کا خاصہ ہے گویا محبوب سے بلا تکلف مکالمہ بھی معاملہ بندی کی ذیل میں آتا ہے رومان نگاری کی نسبت سے معاملہ بندی کی اہمیت مسلمہ ہے اس لیے جب رومانوی تحریک زوروں پر تھی تو اُس عہد کے شعراء کے ہاں معاملہ بندی کی تمثیلات نادر النظیر اور پورے کروفر سے ملتی ہیں حکیم مومن خان مومؔن کا شعری کینوس بھی معاملہ بندی سے مملو ہے اس حوالے سے ان کا یہ شعر بے حد مقبول ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مذکورہ شعر کے حوالے سے روایت مشہور ہے داد دیتے ہوئے مرزا غالؔب نے کہا تھا ''میاں میرا پورا دیوان لے لو اور یہ شعر دے دو'' گویا خراجِ تحسین کا یہ ایک بھرپور انداز تھا اس طویل تمہید کا

مقصد معاملہ بندی کی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنا ہے شذرہ ھٰذا میں ہم سحر علی کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کے کلام میں معاملہ بندی کا التزام پایا جاتا ہے اور یہ مزان کی شعوری کوشش نہیں ہے بلکہ ان کے سخن کا فطری لازمہ ہے جس میں محاورہ اور معاملہ بندی کے عناصر نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں یہ کیفیت اس قدر کثرت سے کیسے در آئی اُن کے سوانحی حالات سے بخوبی روشنی پڑتی ہے واقعہ یوں ہے کہ اُن کے شوہرِ مالوف شادی کے بعد جلد انہیں داغ مفارقت دے گئے تھے جس کی وجہ سے ان کا کلام ملالے کا حامل نظر آتا ہے سحر علی کا تعلق کراچی سے ہے ہم ان کے پہلے شعری مجموعہ مطبوعہ 2001 ''تمہارے غم کے موسم میں'' کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں مجموعہ ھٰذا کا نام بھی فطری معاملہ بندی کا آئینہ دار ہے کتاب ھٰذا کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی، سرشار صدیقی، خالد علیگ اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کی آرا ثبت ہیں۔

اُن کے گنج شعر میں محبوب کی ستمگری، بے وفائی، کج ادائی اور بیم و رجا کے عمیق حوالے ملتے ہیں اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا حزن بھی مسرت آمیز، لطف انگیز اور نکہت بیز ہے اس سے معاملہ بندی کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کے چار اشعار دیدنی ہیں۔

نہ باتیں یاد رہتی ہیں نہ وعدے یاد رہتے ہیں
وہ سب کچھ بھول جاتا ہے نظر جس دم بدلتا ہے
تری فرقت کے یہ آنسو کسی دن رنگ لائیں گے
خزاں کو فصلِ گل میں گریۂ شبنم بدلتا ہے
تری آمد پہ لوٹ آتی ہیں جو ڈوبی ہوئی نبضیں
سرودِ سرخوشی میں نوحۂ ماتم بدلتا ہے
لبوں پہ اُس کے لہراتی ہے جب اک مسکراہٹ سی
سحر مجھ میں ہجومِ یاس کا موسم بدلتا ہے

معاملہ بندی کے پہلو بہ پہلو اُن کے ہاں ایک زبردست قسم کی رومان نگاری ہے رومانوی حوالے سے اُن کے تخیلات عمومی اور روایتی نوعیت کے ہیں بلکہ ایک ندرت فکر ہے جو اشکار ہو رہی ہے جس میں وفا شعاری بھی ہے اور جاں سپاری بھی ہے اسی نسبت سے اُن کی ایک غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

وہ تو سمتوں میں بٹ گیا ہے مگر
میں کہ اب تک ہوں اُس کے محور میں

مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ بھی اُن کے بے شمار اشعار ہیں جو معاملہ بندی کی حسیں پاسداری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

شب تری جدائی پر
رو پڑا ہے موسم بھی
مہرباں بھی وہ مجھ پر
اور مجھ سے برہم بھی
مجھ کو ہر سوال اس کا
صاف بھی ہے مبہم بھی

☆

سحر لگتا ہے کیوں اچھا؟
مجھے اس کا ستم سہنا

سحر علی نے زیادہ تر مفرد بحور میں طبع آزمائی کی ہے عروضی تلازمات کا اہتمام بخوبی ملتا ہے متذکرہ امتیازات اس امر کی شاہد عادل ہیں کہ ان کا کلام اپنے اندر ایک شانِ معاملہ بندی سموئے ہوئے ہے اس کے ساتھ ساتھ اگر اپنے فنِ شعر میں دیگر صنائع بدائع کی فضا قائم رہے تو فکری وفنی اعتبار سے اُن کا کلام مزید حسن کا حامل ہو جائے گا۔

سحرؔ علی (کراچی)

محبت کی نشانی میں نہیں ہوں
میں خود اپنی کہانی میں نہیں ہوں

دیا روشن ہے دل کے غم کدے کا
ہواؤں کی روانی میں نہیں ہوں

مجھے پہچان ہے اپنے عدو کی
خمارِ بدگمانی میں نہیں ہوں

بڑے آرام سے دن کٹ رہے ہیں
تمہاری مہربانی میں نہیں ہوں

یہ تنہا زندگی میری سلامت
کسی کی زندگانی میں نہیں ہوں

مری مٹی عبارت ہے دکھوں سے
خوشی کی ترجمانی میں نہیں ہوں

قیامت ہیں اندھیرے زندگی کے
سحرؔ کی ضوفشانی میں نہیں ہوں

سحر علی (کراچی)

عاشقی میں کیا بدلا میرے آشنا کا رنگ؟
زندگی کے آنچل سے اڑ گیا وفا کا رنگ

راستہ بدل ڈالا میں نے اپنے خوابوں کا
دوستی کی آنکھوں میں دیکھ کر جفا کا رنگ

جانے کب بدل جائے ناگہاں مزاج اس کا؟
جس طرح بدلا ہے دفعتاً ہوا کا رنگ

کانچ کا بدن لے کر سنگ سے الجھنا کیا؟
تم نے کیا نہیں دیکھا عشق میں سزا کا رنگ؟

شب کی سیج پر جونہی لی سحر نے انگڑائی
خواب کی ہتھیلی سے مٹ گیا حنا کا رنگ

شاہدہ لطیف، لطیف جذبات کی شاعرہ

ایسے تمام جذبے جو مسرور کن، پر کیف، خوشگوار رجائیت آمیز اور لطافت سے لبریز ہوں لطیف جذبے کہلاتے ہیں عصرِ حاضر میں حیات انسانی مسائل کی اماجگاہ بنی ہوئی ہے اور زندگی کرا جز ہے شیرلانے کا مثیل ہے جس کی بدولت اجتماعی ذہنی تناؤ نمو پاش ہوا ہے ایسی صورت احوال کے باوجود بھی جو لوگ احساسِ طرب اور رجائی امکانات رکھتے ہیں وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں ایسے درخشاں ستاروں میں ایک نام شاہدہ لطیف کا بھی ہے جن کی زیست ہمت و حوصلے کی ایک ولولہ انگیز داستان ہے ان کا تعلق اسلام آباد سے ہے "اوورسیز انٹرنیشنل" نامی جریدے کی ادارت بھی کر رہی ہیں انہوں نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے آدرش میں وسعت پیدا کی اور نسائی شعری ادب میں اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں آج ہم ان کے اولین شعری مجموعہ "معجزہ" مطبوعہ 1999ء میں سے منتخب غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں تنقیدی اکائی کے طور پر کتاب خدا کا رنج اول شاملِ شذرہ کرتے ہیں اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

عصرِ حاضر پر آشوب زندگی اس قدر محیط ہے حال کے غم کے ساتھ ساتھ فکرِ فردا مہیب صورت اختیار کر گئی ہے جس سے خزینہ شعری ادب کو فروغ میسر آیا ہے جب کہ اس کے مقابلے میں طربیہ ادب اس کا عشر عشیر بھی نہ ہو گا اس لیے ایسے شعراء و شاعرات کا دم غنیمت ہے جن کے ہاں لطیف انداز میں رجائی تاثرات ملتے ہیں انہیں احباب تگ و تاز میں شاہدہ لطیف بھی شامل ہیں

جنہوں نے تلخ حقائق کو مسلمہ گردانتے ہوئے بھی نگہت بیز شاعری کی ہے اس تناظر میں ان کی ایک پوری غزل زیبِ قرطاس ہے۔

وحشت ہے کہ حسرت ہے خدا خیر کرے گا
دنیا کی جو حالت ہے خدا خیر کرے گا
آنکھیں میری دیکھیں گی تماشا یہ کہاں تک؟
ہر سمت میں نفرت ہے خدا خیر کرے گا
ہنگامہ سا رہتا ہے یہاں شام سویرے
ہر شخص پہ عجلت ہے خدا خیر کرے گا
میں شاہدہ دنیا کو جنت سا بنا دوں
میری تو یہ نیت ہے خدا خیر کرے گا

حالات کی آشوب زدگیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھی بہتر توقعات رکھتی ہیں یہ لطیف احساس عمیق رجائیت کا حامل ہے وہ دنیا کے ہر نظریاتی فرد کی طرح سنسار کو مثالی بہشت کے طور پر دیکھنا چاہتی ہیں جو ہر سچے اور کھرے تخلیق کار کی پہچان ہے۔

رومانوی حوالے سے بھی اُن کے ہاں لطیف احساسات وفور سے ملتے ہیں جیسے خیالات کا ایک حسین جشنِ طرب سجا ہوا ہو ان کا قاری زندگی کی بیزاری سے بہت دور رہتا ہے ان کے ہاں ایک نئی امید اور نیا ولولہ ملتا ہے لمس کی لذت سے وہ موسم کا نکھار مشاہدہ کرتی ہیں اس طرح آنکھوں کے رستے سے دل تک کی مسافت طے ہوتی ہے محبوب کا تقرب مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے اور روح کو سرشاری سے نوازتا ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار ملاحظہ کرتے ہیں۔

تھاما جو اُس نے ہاتھ موسم نکھر گیا
آنکھوں کے رستے میرے دل میں اتر گیا
میں اُس کے ساتھ ساتھ بڑی دور تک رہی

وہ اجنبی تو روح میں خوشبو سی بھر گیا

اُن کی قوتِ متخیلہ لطیف احساسات کی کھوج میں رہتی ہے اس لیے کہیں وہ فضا میں آنچل لہرانے کی بات کرتی ہیں تو کہیں انہیں موسمِ گل شرماتا ہوا دکھائی دیتا ہے زیست کی قوس قزح کے رنگوں میں چاہت کا رنگ ہی انہیں مرغوب ہے بقول راقم الحروف ۔

زندگی کی بھیڑ میں اب کھو گئیں رعنائیاں
رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں سب محبت کے سوا

ان کے ہاں ایک خود اعتمادی کی فضا خارزارِ ہستی میں وہ اپنے کردار سے بخوبی واقف ہیں اس لیے وہ محبتوں کی بات کرتی ہیں ۔

میرا آنچل فضا میں لہرایا
موسمِ گل تمام شرما گیا
سب دھنک اوڑھ کر سوائی ہیں
رنگ چاہت کا ایک ہی بھایا

وہ پر کیف انداز میں امیدوں اور تمناؤں کا درس دیتی ہیں ان کے شعری مخزن میں بے پناہ جسارتیں ہیں عزم و حوصلے کی داستان ہے جو سدا بہار اور پل پل جوان ہے اس لیے ان کا قاری یاسیت و قنوطیت سے مبرا و ماورا رہتا ہے ۔

حوصلے ہوں بلند راہوں میں
منزلوں کے نشاں بھی ملتے ہیں

اُن کی روداد حیات رجائیت سے لبریز ہے ان کی فکر نشاط انگیز ہے جہاں کی ظلمتیں انہیں خوفزدہ نہیں کر سکتیں کسی بھی صنفِ نازک کے ہاں ایسے خیالات کا ہونا لطف امیز ہے اور خوش آئیند ہے ۔

نہیں ہے تیرگی کا خوف ہر گز

ہمیں روشن ستارا مل گیا ہے

رواں ہے شاہدہ اپنا سفینہ

اسے دریا کا دھارا مل گیا ہے

الغرض شاہدہ لطیف نسائی شعری ادب میں ایک لطیف آواز ہے جس کی گونج شعری تاریخ کے ہر عہد میں تروتازہ رہے گی۔

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن
ڈاٹ کام

شاہدہ لطیف (اسلام آباد)

خواب گلاب ستارے کیسے؟
دریا موج کنارے کیسے؟

نظریں دھوکہ کھا جاتی ہیں
بدلیں رنگ نظارے کیسے؟

ہم ہوں گے یا سورج ہو گا
سورج رات اُتارے کیسے؟

پھولوں کی خوشبو کے بدلے
ملتے ہیں انگارے کیسے؟

دنیا خود تخلیق ہے اپنی
ہمدم کون سہارے کیسے؟

شاہدہ لطیف (اسلام آباد)

دل میں اک ارمان ابھی تک زندہ ہے
تجھ سے وہ پیمان ابھی تک زندہ ہے

قائم دائم ہے یہ دنیا آج تلک
چاہت سے انسان ابھی تک زندہ ہے

میری سوچ خیالوں میں ہے وہ اب تک
یادوں کا طوفان ابھی تک زندہ ہے

اپنا اپنا سا لگتا ہے جانے کیوں
وہ جو تھا انجان ابھی تک زندہ ہے

جانے کیسا گیت فضا میں گونجا تھا؟
اس کی لے اور تان ابھی تک زندہ ہے

شبہ طراز نظمِ جدید کی شاعرہ

جب ہم نظمِ جدید کی بات کرتے ہیں تو مراد ندرت آمیز اظہار اور جدت انگیز افکار ہوتے ہیں جس کے لیے ہیئت کا جدید ہونا بھی ضروری ہے پرانی بوتل میں نئی شراب ڈالنے کو جدت نہیں کہا جا سکتا آج ہم شبہ طراز کی نظم گوئی کے حوالے سے گویا ہیں اُن کی نظمیں فکری وفنی اعتبار سے جدید رنگ، ڈھنگ اور پیرایۂ اظہار رکھتی ہیں وہ چونکہ ایک افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے اُن کی نظموں میں افسانوی انداز بھی دکھائی دیتا ہے اُن کا سوچنے کا انداز الگ تھلگ نوعیت کا حامل ہے اس لیے وہ نظم کے حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتی ہیں ابھی تک اُن کے دو شعری مجموعے ''جھیل جھیل اُداسی'' اور ''ریپنزل'' منصۂ شہود پر آ چکے ہیں آج ہم اُن کے مؤخر الذکر شعری مجموعے منتخب نظمیہ اقتباسات کا فکری وفنی تجزیہ پیش کریں گے۔

اُن کی نظموں میں زندگی کی واضح اور حقیقی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اکثر وبیشتر نظموں میں اُن کا انداز فلسفیانہ نوعیت کا ہوتا ہے اس لیے اُن کے ہاں نچلی اور سطحی خیالات معدوم ہیں وہ عمومی معاملات کو ایک خاص پیرائے میں بیان کرتی ہیں جس کی بدولت اُن کے افکار اعلیٰ وارفع دکھائی دیتے ہیں اُن کے جذبات واحساسات کی رفعت میں اُن کا اسلوب کلیدی کردار ادا کرتا ہے اُن کی قوتِ متخیلہ بڑے بڑے فلسفے تخلیق کرنے پر قادر نظر آتی ہے ذیل میں ہم اُن کی نظم ''خود شناسی'' دیکھتے ہیں جو اجتماعی ادراکات کی عمدہ دلیل ہے جس میں مسئلہ جبر کو انتہائی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

ہم کہ ہیں جہدِ مسلسل کی کوئی ادنیٰ مثال
ہم کہ ہیں عالمِ معلوم کی بے بس بستی
رو بہ زوال
کچھ نہ سہی، پھر بھی ہیں
فکر کی رو میں بھٹکتا ہوا اک لمحہ
خلق کی زد میں بھٹکتا سا
اچھوتا سا خیال

غزل کی ریاضت کے باعث اُن کی آزاد نظم میں قوافی اور ردیفوں کا فطری التزام وانصرام ملتا ہے اُن کے تخیل میں ایک زبردست روانی پائی جاتی ہے انھوں نے کلاسیکس نوعیت کی نظمیں بھی کامیابی سے کہی ہیں وہ اپنی نظم کو منطقی انجام تک پہنچانے کا مکمل ادراک رکھتی ہیں ان کے موضوعات اچھوتے اور نادرالنظیر ہیں اُن کی ایک نظم ''موت اندر سے شروع ہوتی ہے'' جو ایک وارداتِ قلبی کا مظہر ہے لائق التفات ہے۔

کسی کے انتظار میں
کسی کے گردِ پیار میں
پیار کے حصار میں
سفر تمام کٹ گیا
کسی کو دل کے حال کا
خیال تک بھی نہ رہا

وہ رعایتِ لفظی سے نظم میں حسنِ ایمائیت پیدا کرتی ہیں اُن کے معمولی لفظی تغیر وتبدل سے تخیل میں جان پیدا ہو جاتی ہے اُن کے ہاں ایک تجسس کا عنصر پایا جاتا ہے جو قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے اُن کی نظم ''نئی کہانی'' زیبِ قرطاس ہے۔

کسی کی میں کہانی تھی

کوئی میری کہانی ہے

کہانی وہ ادھوری تھی

کہانی یہ ادھوری ہے

مکمل اب اسے ہونا پڑے گا

کہانی کی روایت ہے

نشانِ ہجر اب دھونا پڑے گا

اُن کی نظموں میں اکثر و بیشتر اُن کے اندر کی شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک افسانہ نویس بھی دکھائی دیتی ہے اسی نسبت سے اُن کی نظم ''نئے حادثے کی تلاش میں'' قابلِ ذکر ہے۔

کہانی نجانے کہاں کھو گئی ہے

یہیں تو کھڑی تھی وہ میرے برابر

چمکتے ستاروں بھرے آسمانوں کے نیچے

مہکتے گلابوں کے اوپر

سمندر کی اٹکھیلیاں کرتی لہروں کے سنگ بہہ رہی تھی

مناظر کے پردے سے ٹکرا کے کچھ کہہ رہی تھی

اٹھایا تھا میں نے اسے جنگلوں کی اندھیری گپھا سے

کہانی جو غصے سے بل کھاتے دریا کی موجوں کے سنگ ڈولتی ہے

کہ موسم کی شدت تمازت سے ڈر کے نہ لب کھولتی تھی

اُن کی متعدد نظمیں منظر نگاری اور تجریدی آرٹ کا شاہکار ہیں جن کی امیجری فن کمال کی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہے اور آنکھوں کے سامنے دلکش اور جاذبِ نظر مناظر دکھائی دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ اُن کی نظم منفرد نوعیت کی حامل ہے اُن کے کلام میں جو روانی اور جولانی ہے وہ اپنی

مثال ہے اُن کے ہاں کہیں کہیں خود کلامی اور مکالماتی فضا پائی جاتی ہے اس حوالے سے اُن کی نظم ''پورٹریٹ'' دیدنی ہے۔

اُس نے پوچھا کون ہو تم؟
میں یہ بولی وقت کہانی بہتا پانی
روپ کی رانی اک دیوانی
اُس نے پوچھا کس کوچے میں رہتی ہو؟
میں یہ بولی دل کی نگری یادکی گلیاں
تنہائی میں غم کا مسکن میرا گھر
اُس نے پوچھا مجھ سے کیسا رشتہ ہے؟
میں یہ بولی رشتوں سے کیا ہوتا ہے؟
لفظوں کی سب ہیرا پھیری
عشق محبت الفت چاہت
حرفوں کے سب تانے بانے
کون کسی کا سب انجانے؟
یہ کہہ کر تصویر ہوئی میں

مشمولہ نظمیں اس امر کی غماز ہیں کہ فکری وفنی اعتبار سے شبہ طراز کی نظم جدت کی حامل ہے البتہ اُن کے فن کو مزید ریاضت اور پختگی مطلوب ہے یہ تو اُن کی منظومات کی چند جھلکیاں تھیں ان کے علاوہ بھی اُن کی بے شمار نظمیں ہیں جو قابلِ ذکر ہیں جن میں ''قربِ قیامت''، ''جلترنگ''، ''رفتِ وقت اور میں''، ''کمینگی''، ''سپنوں کے باہر کھڑی دعا''، ''تمنا کے جزیرے کا دوسرا کنارہ''، ''سب کچھ میں اور کچھ نہیں'' اور ''رچرڈ ل'' شامل ہیں۔ دعا ہے کہ خدائے لم یزل اُن کی نظم کو فزوں تر معیارات رفق و رعنائی بخشے۔ (آمین ثم آمین)

شبہ طراز (لاہور)

سب امتحان عشق کے اپنے کڑے رہے
ہم کوزہ گر کے چاک پہ برسوں پڑے رہے

ان کی نگاہیں شوخ تھیں ہم تھے حیا پسند
مشتاق وہ ، ہم اپنے کیے پر اڑے رہے

سوچا تھا ساتھ مل کے جئیں گے تمام عمر
مصروف تھے وہ کام ہمیں بھی بڑے رہے

دونوں جہاں سے رابطہ رکھنا تھا برقرار
آنکھیں فلک پہ پاؤں زمیں میں گڑے رہے

بجھنے دیا نہ رات بھر ہم نے چراغ شوق
پلکوں پہ رت جگوں کے نگینے جڑے رہے

خوابوں سے نیند مانگ کے لائے تھے مستعار
وہ ساری رات خواب میں ہم سے لڑے رہے

بیٹھے رہے ہم رات کی راہوں کے خواب گر
دن مرحلۂ دید میں حائل کھڑے رہے

شبہ طراز (لاہور)

ساتھ ہے رنجِ رائیگانی بھی
کاٹنی ہے یہ زندگانی بھی

اب تلک جل رہے ہیں کچھ لمحے
حالانکہ آنکھ میں ہے پانی بھی

کچھ محبت سے بات کرلی تھی
کام آئی زبان دانی بھی

ایک تحریر تو سنائی تھی
ایک تصویر ہے دکھانی بھی

سب اُسی کے لیے ہیں سرگرداں
سنت ، سادھو ، ولی ، گیانی بھی

توڑ کر رکھ دیا ہے دل میرا
ساتھ لے جاؤ یہ نشانی بھی

بھول جاتے ہو جب بچھڑتے ہو
یاد ہو جاؤ ناں زبانی بھی

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

شگفتہ شفیق فطری اظہار کی شاعرہ

جو سخنور اپنے فن کو لسانی گورکھ دھندوں اور فکری موشگافیوں کے جھمیلوں میں الجھانے سے گریزاں رہتے ہیں ان کا طرزِ اظہار فطری نوعیت کا حامل ہوتا ہے اس طرح ان کی رسائی قاری کے دل و دماغ پر براہ راست ہوتی ہے وہ جلد ہی مقبولیت و پذیرائی سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ایسے ہم سخن احباب میں ایک نام شگفتہ شفیق کا بھی ہے جنہوں نے انتہائی قلیل عرصے میں شہرت و پسندیدگی کے زینے طے کیے ہیں وہ تسلسل سے مشاطگیِ عروسِ سخن میں منہمک ہیں ان کی پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ اب تک ان کے تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں بنیادی طور پر ان کا تعلق کراچی سے ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''جاگتی آنکھوں کے خواب'' مطبوعہ 2013ء کے ثلث اول کے منتخب غزلیہ اشعار شاملِ تجزیہ کرتے ہیں اور ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''یاد آتی ہے'' کے نظمیہ اقتباسات بھی شاملِ صراحت کرتے ہیں۔

فکری اعتبار سے ان کے ہاں بے پناہ خوشگواریاں ہیں لطیف جذبات و احساسات کی ایک قوسِ قزح ہے جو رنگ ریزیاں کر رہی ہے وہ زیست کے مصائب و آلام سے خوفزدہ نہیں ہوتیں بلکہ انہیں زندگی کا جزو لاینفک گردانتی ہیں عالمِ ہجراں میں وہ دامنِ امید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتیں یہ وہ فکری خصائص ہیں جن کے باعث قاری کی ان کے کلام سے ہم آہنگی برقرار رہتی ہے اس پسِ منظر میں ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ التفات ہیں۔

گھر میں پھولوں کی کاشت کرتی ہوں

اب زمانہ نہیں ہے وحشت کا
کیوں شگفتہ اُداس رہتی ہو؟
سب پہ آتا ہے وقت فرقت کا

اُن کا تخیل سدا بہار نوعیت کا ہے وہ ماحول میں تازگی اور شگفتگی بکھیرنا چاہتی ہیں ان کا مخزنِ شعر سدا بہار نوعیت کا ہے اس سلسلے میں وہ عملی طور پر کوشاں بھی نظر آتی ہیں جذبوں کی لطافت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں حقیقی زندگی کے حوالے سے آموزگاری کے بے پناہ شواہد بھی ملتے ہیں وہ قاری کو ایک عمیق شعور سے روشناس کراتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس سے ان کے ذاتی ادراکات کی جھلک نمو پاشیاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

بڑی ہے گھٹن ابرِ باراں کہاں ہے؟
شجر ایک تازہ ہے ہم نے لگایا
ہر اک دوست ہوتا نہیں ہے سفر میں
تمہاری اداؤں نے ہم کو سکھایا

کدورتوں بھرے سماج میں وہ محبتوں کا آدرش رکھتی ہیں نفرتوں کی بیخ کنی چاہتی ہیں چاہتوں کے حصول کے لیے وہ نازیبا ہتھ کنڈوں کو روا نہیں سمجھتیں الفتوں کے اس سفر میں انسان کو بے انت غم والم بھی ملتے ہیں محرومیوں کا دکھ بھی ہوتا ہے اور حسرتوں کا ماتم بھی اس لیے ان کے کلام میں کتھارسس کی فزوں تر خصوصیت پائی جاتی ہے اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کے دو اشعار دیدنی ہیں۔

پیار سے کیجیے جہاں تابع
آزمائیں نہ جادو ٹونے کو
اشک ہی رہ گئے ہیں آنکھوں میں

حیات کے دیگر موضوعات کے پہلو بہ پہلو ان کے ہاں رومانوی حوالے بھی فطری نوعیت میں ملتے ہیں جو ان کے فطری اظہار کی برہانِ قاطع دلیل ہیں ان کے رومان جذبے حزن و یاسیت کو نہیں جنم دیتے اور نہ کہیں افسردگی آشکار ہوتی ہے بلکہ طرب خیز کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عمومی موضوعات کے ساتھ ساتھ انہوں نے زندگی کے انتہائی سنجیدہ موضوعات کو بھی اپنے بیان کی زینت بنایا ہے زیست کی بے ثباتی کا اظہار ان کے ہاں نہایت فطری انداز میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔

زندگی تو فانی ہے سب ہی لوٹ جائیں گے
آج وہ گئے آگے کل کو اپنی باری ہے

ہیت کے اعتبار سے شاعری کی دو اصناف ہیں۔غزل اور نظم نظم کی کئی ہیتیں ہیں، جن میں مثنوی، ثلاثی قطعہ بند، مخمس، مسدس، مثمن، مستزاد، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم شامل ہیں۔ آزاد نظم کی کامیابی کے بعد نثری نظم کے امکانات روشن ہونے لگے۔نثری نظم میں وزن، قافیہ، ردیف اور مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔آزاد نظم میں ارکان کی کمی بیشی روا ہوتی ہے، لیکن نثری نظم میں ارکان سرے سے معدوم ہوتے ہیں۔ بلکہ سطور چھوٹی اور بڑی ہوتی ہیں۔جس طرح غزل اور نظم میں ہیت کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے، اسی طرح ان اصناف کے فکری مزاج میں بھی مغائرت پائی جاتی ہے۔نظم میں فکری اعتبار سے وسعت پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس میں زیادہ تصریح و توضیح کی گنجائش ہوتی ہے، جس کے باعث منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور محاکات نگاری بخوبی کی جا سکتی ہے۔ تسلسل نظم کا تلازمہ ہے۔خیالات زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔نثری نظم بطور خاص سلاست کا مظہر ہوتی ہے۔نثری نظم میں فنی حوالے سے بہت گنجائش پائی جاتی ہے۔تاہم فکری اعتبار سے کسی قسم کا سمجھوتہ روا نہیں ہے۔ مذکورہ بحث تمہید ہے اُس شذرے کی جو ہم شگفتہ شفیق کے حوالے سے رقم کر رہے ہیں۔تا کہ ہم اُن کی نظم کے فکری و فنی خدوخال اُجاگر کر سکیں۔شذرہ ھٰذا میں ہم شگفتہ شفیق کے

دوسرے شعری مجموعے ''یاد آتی ہے'' کے حوالے سے اُن کی نظم کا فکری وفنی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ مجموعہ ہذا جنوری 2013ء میں زیورِطباعت سے آراستہ ہوا۔قبل ازیں ان کا اوّلین شعری مجموعہ ''مرا دل کہتا ہے'' 2010ء میں منصۂ شہود میں آیا، جس میں غزل، پابند نظم اور زیادہ تر آزاد نظمیں شامل ہیں۔

اُن کے افکار و موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے اور مختلف کیفیات کی جلوہ افروزی ہے۔ کہیں بزمِ طرب سجی ہوئی ہے تو کہیں آشاؤں کے میلے ہیں۔ کہیں اُداسی کی شاموں کا ذکر ہے تو کہیں بہار پُرنکھار ہے۔ کہیں جمالیاتی حوالے ہیں تو کہیں رومان کی روح پرور فضا ہے۔ اُن کی ایک نظم ''گلابوں کا موسم'' میں اُن کی منظر نگاری ملاحظہ کریں ۔

''گلابوں کا موسم''

موسم دھوپ اور
روشن کرنیں
تتلیاں آئی تھیں
پھولوں سے ملنے
باغوں میں تھے پھول کھلے اور
خوابوں کا سا میلہ تھا
بہار کا موسم
ساتھ سجن کا
نہلے پر بس دہلا تھا

نظم ھٰذا میں جہاں منظر نگاری کمال کی ہے وہاں جمالیاتی حوالہ بھی انتہائی دل فریب ہے۔ خیالات کا تسلسل بھی دیدنی ہے۔ لغت کا استعمال بھی فطری انداز رکھتا ہے۔ اسلوب کی سادگی بھی

اپنا ایک حسن رکھتی ہے اور رومان کا بھی پُرکشش حوالہ شامل ہے۔

رومان ہر عہد میں اقلیمِ سخن کی جان رہا ہے۔ اگرچہ عصرِ حاضر کے ناقدین کے افکار نے اسے مسخ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی مقبولیت میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ رومانی حوالے کی حامل اُن کی نظم ''تم'' زینتِ قرطاس کی جاتی ہے۔

''تم''

تم دل کے پاس رہنا، میرے ساتھ ساتھ رہنا
جو بھی ہوں من کی باتیں، ہر بات مجھ سے کہنا
پڑے تم پہ کوئی مشکل تو اکیلے تم نہ سہنا
یوں ہی خون کی طرح سے، مری سب رگوں میں بہنا
جب ہو مری ضرورت، مجھ کو پکار لینا
میرے آنسوؤں کو چھوڑو، بس تم کبھی نہ رونا
کانٹے ہیں سارے میرے بس تم گلاب لینا
کہنا یہی ہے تم سے، تم دل کے پاس رہنا

یہ نظم رومانیت کے احساسات سے لبریز ہے۔ سلاست اور سہل نگاری سے خوب صورت جذبات کو فطری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مختلف کیفیات کے دل فریب حوالے ہیں اور یارِ ہزار شیوہ سے بے پایاں محبت کا اظہار بھی ہے۔

رومانی حوالے کی حامل اُن کی ایک اور نظم ''احساسِ خیالِ دوست'' آپ کے ذوقِ طبع کی نذر ہے۔

''احساسِ خیالِ دوست''

مری اک بات سن لو جی
میں الفت تو نہیں کرتی
مجھے ہے اُنسیت تم سے
تمہارے بن بھی جیتی ہوں
بڑی خوش باش رہتی ہوں
جو مل پاؤں اگر تم سے
چمک آنکھوں کی بڑھتی ہے
اُمنگ جینے کی ملتی ہے
کچھ ایسا مجھ کو لگتا ہے
الگ دنیا کی باسی ہوں
جہاں شامیں سہانی ہیں
اور رنگوں کی فراوانی
جہاں غم دور رہتے ہیں
وہاں ہے ہر طرف مروت
اور احساسِ خیالِ یار

اس نظم میں شگفتہ شفیق کی تخلیقی طبع کھل کر سامنے آئی ہے، جس کی وجہ سے خیالات کا ایک فطری بہاؤ مشاہدے میں آیا ہے جس میں برجستگی و بے ساختگی اور بے تکلفی کے جواہر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

غم زندگی کا جزو اور دائمی جذبہ ہے جو زندگی پر انمٹ نقوش مرتب کرتا ہے۔ حزن وملال کی کیفیات کا اظہار اکثر و بیشتر شعرا کے ہاں پایا جاتا ہے جو شعراحزنیہ شعری طبع رکھتے ہیں، ان کا کلام خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مقبولیت میر کا باعث بھی فکری حوالے سے ان کی حزینہ

شاعری ہے۔غم کئی طرح کا ہوتا ہے۔اُس کی نوعیت کچھ بھی ہوسکتی ہے۔غمِ دوراں بھی ہوسکتا ہے۔ وہ غمِ جاناں بھی ہوسکتا ہے اور غمِ ذات بھی۔ وہ محرومی کا دُکھ بھی ہوسکتا ہے۔اُن کی نظم ''سانحہ'' ہے۔اُن کے حزن وملال کی جھلک دیکھتے ہیں۔

''سانحہ''

عجب سا سانحہ ہوا ہے
ٹہنیاں ساری
رہ گئیں خالی
پتے سارے ہوا کے ساتھ گئے
چار سو چھا گئی
وہ زرد خزاں
جس کو کوئی پسند نہیں کرتا
کوئی طلبگار اس کا ہے ہی نہیں
پھر بھی وہ ڈھیٹ
لپٹی جاتی ہے
انجان سفر دکھاتی ہے
اور اُداسی
بکھیر جاتی ہے

شگفتہ شفیق کا فکری کینوس بہت وسیع ہے کہ موضوعات میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔مختلف خیالات اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔شذرہ طذا کی آخری اکائی کے طور پر اُن کی نظم ''مکافاتِ عمل''نذرِ قارئین ہے۔

''مکافاتِ عمل''

مجھے گلہ ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے بات نہیں کرتا
چُپ چاپ بیٹھا رہتا ہے، مسئلے شیئر نہیں کرتا
تیس برس میں پیچھے جاؤں تو مجھ کو یاد آتا ہے
میں بھی یوں ہی کرتا تھا
جب میری بوڑھی ماں مجھ سے باتیں کرتی تھی
میں گھر سے بھاگنا چاہتا تھا
پر اتنی ہمت مجھ میں نہیں تھی
مجبوری کی یاری تھی
پر میرا بیٹا بولڈ بہت ہے
مجھ سے کہہ کے جاتا ہے
بیٹھیں آپ سکون سے کھائیں
بیچ میں ٹانگ اڑائیں نہ
نئے زمانے کی باتیں ہیں
آپ مجھے سمجھائیں نہ

اس نظم میں انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ مکمل وفاداری کی ہے کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے انسان جو رویہ آج کسی سے روا رکھتا ہے کل کو اُسے اسی رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معاملہ ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کے مصداق ہو جاتا ہے۔ اس نظم سے ایک اور فکری پہلو بھی سامنے آتا ہے جسے نسلی خلا یا جنریشن گیپ کہتے ہیں۔ جسے نئی نسل اور پرانی نسل کی ذہنی تفاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شگفتہ شفیق کے فکری مخزن میں طرح طرح کے جواہر موجود

ہیں، جن سے قاری اکتسابِ فیض بھی کرتا ہے۔ اُن کے ہاں مقصدیت کے پہلو بھی پائے جاتے ہیں اور تفریحِ طبع کے آثار بھی۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ شگفتہ شفیق کی نظم کا اسلوب اور افکار جاذبیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مطالعے کے دوران کہیں بھی قاری کی دل چسپی کا دامن میلا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا شوق فزوں سے فزوں تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُن کی فکر قاری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور قاری اُس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ انہیں فکر و فن کے اسرار و رموز کی مزید جانکاری سے نوازے اور فکری و فنی بالیدگی ودیعت فرمائے۔

مذکورہ چند استشہادات مشتے از خروارے کے مصداق ان کے فطری اظہار کی جھلکیاں ہیں، جس سے اس انکشاف کو تقویت ملتی ہے کہ ان کا اسلوب فطری اظہار سے مرصع ہے۔ اگر وہ متقدمین و متوسطین اور متاخرین کی نظم و نثر کا مزید عمیق نظری سے مطالعہ کریں تو ان کے فکر و فن میں پہلے سے فزوں تر بالیدگی کے مظاہر ہویدا ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شگفتہ شفیق (کراچی)

یوں رشتہ بھی تجھ سے نبھایا ہے میں نے
ترے غم کو اپنا بنایا ہے میں نے

اُسے بھول جانے کا سوچا جو میں نے
تو مشکل سے دل کو منایا ہے میں نے

میں اُس کو کبھی بھی اُجڑنے نہ دوں گی
چمن اپنے خوں سے سجایا ہے میں نے

ثمر اُس کا مجھ کو بھی مل کے رہے گا
جو الفت کا پودا لگایا ہے میں نے

فنا کر کے خود کو بس اک تیری خاطر
محبت کا جادو جگایا ہے میں نے

شگفتہ شفیق (کراچی)

شکایت ہے تم سے یہ ہم کو گلہ ہے
کہ الفت کے بدلے میں دھوکا ملا ہے
مزاجوں کی نرمی نہ راس آئی سب کو
ہوا مہرباں جو بھی وہ ہی رُلا ہے
وہ دل کا لگانا بھی کیا دل لگی تھی؟
یہ عقدہ ابھی تک نہ ہم پہ کھلا ہے
بڑی آس سے جب بھی دیکھا ہے تم کو
نیا زخم مرہم کے بدلے لگا ہے
کہاں تک سمندر کی لہروں سے لڑتے؟
کہ ہاتھوں میں میرے تو کچا گھڑا ہے
تیرے ساتھ چلنے کی ضد ہی غلط تھی
نصیبوں سے اپنے کوئی بھی لڑا ہے
اکیلے میں ڈستی ہے ساون کی رم جھم
بڑا وقت آ کے یہ ہم پہ پڑا ہے
تیری یاد سے دل بھی روشن ہے ایسے
کہ جیسے اندھیرے میں جگنو ملا ہے
شگفتہ سا چہرہ مہکتا ہے من میں
کہ جیسے چمن میں کوئی گل کھلا ہے

شاہینہ عندلیبؔ روایتی طرزِ فکر کی شاعرہ

عصری ادب کا ایک سنگین المیہ ہے کہ روایتی طرزِ فکر کو معیوب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ روایت ہر ادب کے قصر کی خشتِ اول ہوتی ہے جس پر اس کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ ہر اچھے ادب کی بنیاد روایت ہوتی ہے لیکن یارانِ جہاں اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں خواہ مخواہ کا جدت کا زعم پروان چڑھ رہا ہے اور بہت سی تخلیقات اس کی بھینٹ چڑھ کر اپنا سوادِ اعظم کھو چکی ہیں ہم جدت کے منکر نہیں جدت کے تقاضے نبھانا ہر کہ ومہ کا کام نہیں ہے معدودے چند شعراء وشاعرات کے ہاں جدت کے شواہد ملتے ہیں جدت کے جنون میں کئی شعراء وشاعرات کے کلام کی لطافتیں مسخ ہو جاتی ہیں الفاظ اور خیالات کا گورکھ دھندا یا چوں چوں کا مربع بنانا قطعاً جدت نہیں ہے بلکہ کلام کی جمالیاتی حسیات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے زعمِ جدت کے اس عہد میں ایسے جی داروں کی چنداں کمی نہیں ہے جنہوں نے گیسوئے روایت سنوارنے میں شب وروز صرف کیے ان کی محنتِ شاقہ اور شبانہ روز کاوشوں کے علی الرغم روایت بصد افتخار سر اُٹھانے کے قابل ہے ایسے اصحاب تگ وتاز میں شاہینہ عندلیبؔ کا اسمِ گرامی لائقِ صد احترام ہے جن کے ہاں روایت کی پاسداری پورے کروفر سے ملتی ہے جن کا اسلوبیاتی اور فکری طرزِ اظہار روایت کا حسین شاہکار ہے جن کے ہاں تخیلات فطری عمومی اور نجی سطح کے حامل ہیں جنہوں نے اپنی عرق ریزیوں کی بدولت روایت کے حسن کو دوچند کرنے کی حتی المقدور سعیِ جمیل کی ہے شاہینہ عندلیبؔ چند سال قبل شعری افق پر نمودار ہوئیں ان کا پیدائشی نام

شاہینہ کوثر ہے والد کا نام سید محمد ارشاد (مرحوم) ہے ان کا تعلق ایک سید خانوادے سے ہے یکم جنوری 1963ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں مارچ 1989ء میں سید الیاس نقوی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں اور ڈیرہ غازی خان میں اقامت اختیار کی اولاً معاشرتی موضوعاتی نوعیت کی پیروڈیاں لکھیں رفتہ رفتہ نظم کی دیگر اصناف کی طرف قدم بڑھایا طاہرہ سوز (مرحومہ) وحید تابش (مرحوم) اور جاوید احسن کے اسمائے گرامی راہنمائی کرنے والوں میں شامل ہیں۔

2012ء میں بعنوان "سفیر شب" ان کا اولین شعری مجموعہ منصۂ شہود پر آیا جاوید احسن، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اور ثمینہ ناز کی جلیل القدر آراء کتاب ھٰذا کا حصہ ہیں مجموعہ ھٰذا میں غزلیات ونظمیات وقطعات اور ہائیکو شامل ہیں ان کے ہاں انگریزی الفاظ کا چلن بھی کہیں کہیں ملتا ہے جو ان کی جہاں انگریزی زبان دانی کا غماز ہے وہاں تنقیدی وادبی حوالے سے کوئی اچھا شگون نہیں ہے مجموعی طور پر ان کا اسلوب سہل نگاری کی روایت کا حامل ہے مگر کہیں کہیں دقیقہ سنجی کے خفیف مظاہر بھی ملتے ہیں جو شوکتِ الفاظ کے باعث اسلوب کی شان بڑھا رہے ہیں آزاد نظمیں بھی ہیں اور پابند نظمیں بھی مگر کہیں کہیں مروجہ ہیئتوں سے انحراف کے پہلو بھی ملتے ہیں آج ہم مذکورہ موضوع کے تناظر میں ان کے مذکورہ شعری مجموعہ سے منتخب غزلیہ اشعار شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔

ان کے ہاں رومانوی نقطۂ نگاہ سے کلاسیکی شعری رویے بہ اندازِ کثرت پائے جاتے ہیں عمومی اور سطحی تخیلات خالص نظری صورت میں ملتے ہیں جن میں ایک معصومیت کارگر نظر آتی ہے رومان کے جذبے ان کے ہاں خالص روایتی طور پر موجود ہیں اسی تناظر میں ان کی غزل کے تین اشعار ملاحظہ کریں۔

آتے نہیں نہ آؤ مگر ہم تو آئیں گے
چاہے نہ تم بلاؤ مگر ہم تو آئیں گے
ہم کو وفا کا پاس ہے ہم بے وفا نہیں
کتنا ہمیں ستاؤ مگر ہم تو آئیں گے؟

دیکھیں گے خواب میں بھی ہم صورت جناب کی
دل سے ہمیں بھلاؤ مگر ہم تو آئیں گے

اُن کے شعری مخزن میں محبت کی کارستانیاں بھی ہیں ستم کے تذکرے بھی ہیں وفا کے قحط کا تذکرہ بھی ہے شب و روز کی آزمائشوں کا احوال بھی ہے غم والم کے شواہد ہیں جو ان کی حزنیہ شعری طبع کی عکاسی کر رہے ہیں یہ سب روایتی شعری رویے ہیں جو پوری آن بان سے جلوہ ریز ہو رہے ہیں ان کی ایک غزل کے دو اشعار دیدنی ہیں۔

اس کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
یہ ستم بھی اُٹھا کے دیکھ لیا
بے ربط زندگی میں وفا کا ذکر نہیں
روز و شب آزما کے دیکھ لیا

وہ زیست کے مصائب و آلام کو بھرپور انداز میں بیان کرتی ہیں مگر فکری و فنی اعتبار سے روایت کی پاسداری بدستور رہتی ہے حیات کی ہولناکیاں، عصری بے حسی، تلخ حقائق کا بیان اور نالہ وشیون کے پہلو پورے طور پر اُن کے ہاں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اسی نسبت سے ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ التفات ہیں۔

زندگی جام ہے کہ پیالہ ہے
ہر گھڑی زہر کا نوالہ ہے
غم کہیں کس سے جا کے ہم اپنا؟
کیا کوئی درد کا ازالہ ہے؟

زندگی کے تجربات و مشاہدات کا عکسِ جمیل بھی ان کے فکری کینوس میں قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی کا وسیع تر ادراک رکھتی ہیں اس لیے ان کے آدرش میں ایک ہمہ گیری جلوہ ریز ہوئی ہے ایک آموزگاری ہے جو ہمہ پہلو نوعیت کی

ہے کہیں خود آموزی کے انداز میں تو کہیں اجتماعی حوالے سے بہر حال وہ اپنے قاری کو جانکاری سے آشنا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں وہ اسے حقیقتوں کے شناور کے طور دیکھنا چاہتی ہیں عصری حقائق ان کے ہاں پورے طور پر نمو پاش ہوتے ہیں جا بجا ان کے اشعار میں عصری رجحانات و میلانات پائے جاتے ہیں وہ اپنے عصری مزاج کی عکاسی میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑتی اس سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر اُن کی غزل کے دو اشعار زیب قرطاس ہیں۔

کسی کا کوئی نہیں جہاں میں
خود آپ اپنا خیال رکھنا
وفا کے موتی بکھر نہ جائیں
ہمیشہ ان کو سنبھال رکھنا

الغرض شاہینہ عندلیب کے شعری ارتقا کا سفر انتہائی سست روی سے جاری و ساری ہے ان کا شوق ان کی شعری صوتیں خشک نہیں ہونے دیتا بلکہ انہیں مہمیز دیتا رہتا ہے ابھی انہیں اقلیم شعر کے ہفت آسمان سر کرنے ہیں عمیق فکری و فنی ریاضت مطلوب ہے خلوص، محنت اور لگن کی بدولت یہ زینے بہ آسانی سر کیے جا سکتے ہیں جس کے لیے انہیں ہر گام پر ایک معتبر راہنمائی کی ضرورت رہے گی۔

☆☆☆☆☆

شاہینہ عندلیبؔ (ڈیرہ غازی خان)

ہرگز نہ تیرے در پہ اب آئیں گے دیکھنا
ہم قصۂ الم نہ سنائیں گے دیکھنا

جتنا ستانا تھا ہمیں تم نے ستا لیا
اب ہم بھی کیسا تم کو ستائیں گے دیکھنا؟

آنکھوں سے تیری یاد میں جاری رہے جو اشک
سیلاب تیرے شہر میں لائیں گے دیکھنا

اکثر وفا کے وعدے نبھاتے ہیں اہلِ درد
مر جائیں گے نہ حال بتائیں گے دیکھنا

تا عمر ہم کسی پر کریں گے نہ اعتبار
اس دھن میں اپنی جان گنوائیں گے دیکھنا

کیسے گناہوں کی یہ سزا مل گئی اے عندلیبؔ
تم کو بھی اپنے ساتھ جلائیں گے دیکھنا

HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

شاہینہ عندلیبؔ (ڈیرہ غازی خان)

شاید قریب آئے ہیں شہرِ نگار کے
جھونکے سے آ رہے ہیں نسیمِ بہار کے

اب تک نہ جانے کیسے خیالوں میں گم رہی؟
دن تو کبھی کے آ گئے فصلِ بہار کے

شاید وہ تجھ سے چال نئی کوئی چل گیا
تو گن رہی ہے بیٹھ کے دن انتظار کے

دامن جھٹک دے تو بھی اب امید و بیم کا
باقی نہیں ہیں آدمی اب اعتبار کے

آنکھوں کو پونچھ ڈھل گئے داغ شبِ فراق
احسان ہیں یہ گردشِ لیل و نہار کے

جائے گا کس طرح سے وہ بستی کو چھوڑ کر؟
جس نے مزے لیے ترے قرب و جوار کے

گلشن میں پھول کھلنے کا موسم گزر گیا
اے عندلیبؔ چل کہ چلے دن بہار کے

شائستہ سحر کربِ ذات کی شاعرہ

سوانحی کرب تخلیقی اظہار میں داخلی احساسات کو فروغ بخشنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے فن پارے میں تخلیق کار کی ذات کی پرچھائیاں مشاہدہ کی جا سکتی ہیں یہی ماجرا شائستہ سحر کے کلام سے اظہر من الشمس ہوتا ہے مشیت کی طرف سے انھیں پر کٹھن جیون ودیعت ہوا جس کی وجہ سے ان کی سخن سنجی میں ذاتی حوالے سے کرب کا پہلو اجاگر ہوا ہے ان کا اصل نام شائستہ پروین ہے اور ادبی نام شائستہ سحر ہے 23 ستمبر 1975ء میں میرپورخاص میں پیدا ہوئیں میٹرک کا امتحان 1989ء میں میرپورخاص سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا 1997ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں اردو ادبیات میں ایم اے کیا اسی سال شکیل احمد سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں اسی سال ہی ان کا اولین شعری مجموعہ "عذابِ آگہی" منصۂ شہود پر آیا۔ مجموعہ ھذا کا نام بھی ان کی حزنیہ شعری طبع کا غماز ہے اور جدت کا مظہر بھی بقول راقم الحروف۔

زمانہ جسے آگہی جانتا ہے
ہماری نظر میں وہ ہے اک اذیت
جہاں میں میں اعلیٰ سے ادنیٰ بنا ہوں
صلے یہ ملے ہیں مجھے آگہی کے

موصوفہ کا تعلق نوید سروش کے حلقۂ تلمذ سے ہے جو ایک طویل عرصے سے شعری ریاضت میں منہمک ہیں شائستہ سحر نے 2005ء میں پبلک سروس کمیشن میں کامیابی حاصل کی تا دمِ تحریر

وہ ن رشد گورنمنٹ گرلز کالج میر پور خاص میں اردو ادب کی تدریس کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں شذرہ ہذا میں ہم ان کے مذکورہ شعری مجموعہ کے منتخب غزلیہ اشعار کرب ذات کے تناظر شامل شذرہ کرتے ہیں۔

اُن کے تمام تر شعری مجموعہ میں اُن کی حزنیہ شعری طبع نمایاں طور پر سامنے آئی ہے ان کے افکار میں سماجی کرب کی ایک گونج سنائی دیتی ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی حوالے ہیں انہوں نے اپنی معاشرت کے مسائل کو واضح کرنے کی سعی جمیل کی ہے سماجی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا ایک درد پایا جاتا ہے نفسانفسی اور خود غرضی کے رویئوں کو بھر پور انداز میں پیش کیا گیا ہے تلخ حقائق کا ادراک زیست کی کٹھنائیوں سے موانست و مصالحت کا شعور ان کے شعری مخزن کا حصہ ہے ان کے تخیلات میں ہمت و حوصلے کے پہلو وافر انداز میں ملتے ہیں وہ مصائب و آلام کا سامنا کرنے کا فن جانتی ہیں جسے وہ انسان کی عظمت کی دلیل گردانتی ہیں۔

رومانوی حوالے سے بھی ان کے افکار میں غم و الم نمایاں ہے عالم ہجراں کا دکھ درد بھر پور انداز میں ملتا ہے ہجر کا سوز و گداز محب کی شخصیت پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے اس حوالے سے ان کے ہاں ایک گہری جانکاری ملتی ہے۔

بعد تیرے میرے چہرے کے بھی رنگ اُڑے
آئینہ دیکھوں تو حیرت نہیں دیکھی جاتی

کلاسیکی اردو شاعری میں مقدر سے شکایت کے حوالے بکثرت ملتے ہیں کہیں گردوں کو ہدف تنقید بنایا تو کہیں فلک لائق طنز ٹھہرا تو کہیں مشیت مورد الزام ٹھہری خوشگوار ماحول میں بھی یاسیت کے عوامل مشاہدہ کیے گئے بقول راقم الحروف۔

سو میرے مقدر کا عالم تو دیکھو
ملی دھوپ مجھ کو جوار شجر میں

اسی نوع کا عالم شائستہ سحر کے ہاں مشاہدہ کرتے ہیں۔

سایۂ گل بھی دھوپ برسائے
ہم نے ایسا نصیب پایا ہے

اُن کی ہاں زیست کی بے ثباتی کی روداد پورے کروفر سے ملتی ہے ان کے نزدیک حیات ایک نہ قابلِ بھروسہ حقیقت ہے اس لیے ان کے تخیلات میں زندگی سے بیزاری نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے جب سانسیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں تو پھر بے ثباتی نا قابل الفت ہے۔

دھڑکن پہ اعتبار کون کرے؟
بے ثباتی سے پیار کون کرے؟

مشیت سے نالہ و شیون کے پہلو بھی ان کے ہاں دلچسپ انداز میں ملتے ہیں کہیں کہیں سپاس گزاری کے پہلو بہ پہلو شکوہ و شکایت کی روایت بھی جلوہ ریز ہوتی ہے جس سے ان کے فکری بانکپن کی دلیل ملتی ہے۔

کرم کی بارشیں ہوتی ہیں عاصیوں پہ مگر
کتابِ غم میں قہرِ خدا کی باتیں ہیں

مشمولہ شواہد شاہد ہیں کہ شائستہ سحر کے ہاں کربِ ذات کی داستاں بھرپور انداز میں موجود ہے اگرچہ کہیں کہیں فنی تناقص نظر آتے ہیں لیکن یہ ان کی اولین کاوش ہے جوں جوں ان کی شعری ریاضت بڑھے گی تو فکری وفنی امور میں مزید نکھار آئے گا۔

نقشِ اوّل دیکھ آئے نقشِ ثانی دیکھنا

☆☆☆☆☆

شائستہ سحر (میر پور خاص)

خزاں نژاد تلاش بہار کرتے رہے
بصد خلوص ترا انتظار کرتے رہے

بٹا ہوا کئی حصوں میں تھا وجود مگر
خیالِ یار فقط تجھ سے پیار کرتے رہے

تمام شب ترے آنے کی آس جلتی رہی
تمام شب ہی ستارے شمار کرتے رہے

تمام عمر دریچے کھلے رہے دل کے
تمام عمر ترا انتظار کرتے رہے

دل و نگاہ کو بچانے میں عمر بیت گئی
عجیب دوست تھے مجھ ہی پہ وار کرتے رہے

تو چاندنی ہی کو الزامِ آشنائی نہ دے
ستارے بھی تو سحر بے قرار کرتے رہے

شائستہ سحر (میر پور خاص)

پریتم من کی آنکھیں کھول
بول پپیہے تو بھی بول

زہر بھری رت بیت گئی
اب تو کان میں امرت گھول

پی لے جام محبت کا
آ میری بانہوں میں ڈول

روح میں بھر دیں اُجیارا
تیرے میٹھے میٹھے بول

آخر کو ہم آن ملے
یہ دنیا یہ دھرتی گول

کب تک من میں ٹھہرے گا؟
اے میرے پردیسی ڈھول

دور کھڑی تیری جوگن
لے کر اپنا دل کشکول

عابدہ کرامت کی فکری جہتیں

فکری اعتبار سے عصری شاعری رفعتِ تخیل سے محروم ہوتی جا رہی ہے افکار میں وہ وسعت و جاذبیت اور ندرت نہیں رہی جو متقدمین کے کلام کا خاصہ رہی ہے سخنور کا شعری کینوس بہت محدود ہوتا جا رہا ہے صرف مکھی پر مکھی مارنے کو سخن سازی کا عمل قرار دیا جا رہا ہے تخیلات کا تانا بانا صرف چند گنجی اور عمومی موضوعات میں ہی سمٹ کر رہ گیا ہے جبکہ شعری مقتضیات یہ ہیں کہ دامنِ شعر کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے اس سلسلے میں موضوعات کو محدودیت کے دائرے سے نکال کر لامحدودیت کے زاویوں میں لانا ہوگا اس سلسلے میں معدودے چند شعراء و شاعرات کے ہاں یہ مساعی نظر آتی ہیں انہیں بالیدہ فکر شخصیات میں ایک نام عابدہ کرامت کا ہے جن کا سخن ہمہ جہتی طرزِ اظہار کا حامل ہے آج ہمارا موضوعِ بیان ان کی سخن سنجی مذکورہ موضوع کے تناظر میں ہے ہم ان کے منتخب غزلیہ کلام کی چند استشہادات برائے تجزیہ شامل کرتے ہیں عابدہ کرامت کا تعلق کراچی سے ہے 2000ء میں ان کا شعری مجموعہ ”دوپٹے میں کہاں تک جذب کرتی“ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ کتاب ھذا کا نام سنائی طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے متذکرہ مجموعے کے حسنِ اول کو شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔

مشیت پر یقین رکھنا انسانی توکل اور غنا کی دلیل ہے اسی دولتِ احساس کی بدولت پندارِ انا قائم و دائم رہتا ہے قدرتِ ایزدی پر بھروسہ تمام دنیاوی سہاروں کے بطلان کا مثیل ہے جب تمام مصائب و آلام حسرتیں اور راحتیں ذاتِ خداوندی کی طرف سے ہیں تو پھر جہاں کے عارضی

سہارے چہ معنی دارد جب اپنے رب سے اس پیکرِ خاکی کا ربط وضبط مضبوط بنیادوں پر استوار ہو تو پھر سنسار کی کٹھنائیاں کچھ معنی نہیں رکھتیں خوشی اور غم میں حد فاصل ختم ہو جاتی ہے پرحزیں شعری طبع گلشن حزن کی آبیاری کرتی رہتی ہیں جس سے آلام کو تقویت جولانی اور روانی ملتی ہے بقول راقم الحروف۔

مرے حزن کو استقامت ملے
غزل میرؔ کی اک سنا دیجیے

انہیں احساسات کی ترجمانی عابدہ کرامت کے ہاں اُن کی ایک غزل کے دو اشعار میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

کس لیے اور کسے پھر رحم و کرم پر جینا؟
جب مری لوح کو وہ دست کرم لکھتا ہے
خوش قلم ، خوشیوں کو تحریر کرتا ہے
جتنے چہرے پر مرے حرف ستم لکھتا ہے

حواسِ خمسہ میں سمعی و بصری صلاحیتوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لیے دنیائے محبت میں ان کا کردار مرکزی نوعیت کا ہے جس میں سماعت و بصارت صرف محبّ پر مرکوز ہو جاتی ہے اس مجذوبانہ عمل میں ذات کا ادراک ختم ہو جاتا ہے اسی تناظر میں اُن کی ایک غزل کا مطلع لائقِ توجہ ہے۔

گوش بن کے سمجھا ہے چشم کر کے دیکھا ہے
اُن کو اپنی ہستی بھی ختم کر کے دیکھا ہے

حیاتِ انسانی صبر و تحمل اور دولتِ ضبط کی متقاضی ہے مصلحت اندیشی زیست کے عمیق ادراک سے عبارت ہے معاملہ دنیائے جنوں وخرد کا ہو یا زندگی کا بردباری کی اہمیت سے کسی صورت میں انکار ممکن نہیں ہے دولتِ ضبط کی بازیافت ہی جیون کی بہت بڑی کامیابی ہے اسی نسبت سے اُن کی ایک اور غزل کا مطلع درالتفات پر دق الباب کر رہا ہے۔

لب سیے ہر زخم اپنا مسترد کرتی رہی
کتنی خاموشی سے میں تیری مدد کرتی رہی؟

عالمِ فردا کا پیشگی شعور انسان کی بسیط فراست ومتانت کا غماز ہوتا ہے ایسے تخیلات شعری تاریخ کے ہر عہد میں زندہ وتابندہ رہتے ہیں یہ افکار زندگی کے کسی بھی شعبہ سے متعلق ہو سکتے ہیں لیکن دنیائے سخن میں سماجیات کی اہمیت مسلمہ ہے کسی بھی سخنور کے سخن کا جائزہ عمرانی نقطۂ نگاہ سے انتہائی ناگزیر ہے عابدہ کرامت اپنی معاشرت کی عمیق جانکاری رکھتی ہیں اس لیے آمدہ نسل کے حوالے سے اُن کے ہاں ایک فکرِ فردا کارفرما ہے جس سے انسان دوستی کے شواہد آشکار ہوتے ہیں اُن کی غزل کا ایک شعر نذرِ قارئین ہے۔

ہے میرے سامنے میری جو نسلِ آئندہ
سو اب کی بار میں اُن کے خواب دیکھوں گی

اُن کے شعری اوصافِ حمیدہ میں اس خصوصیت کو انتہائی اہمیت حاصل ہے کہ ان کے ہاں تنوع خیالی اور پہلو داری ایک حسنِ التزام کے ساتھ کارفرما ہے جو اُن کے ہمہ جہت افکار کی مثیل و دلیل ہے مگر اس امر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اشعار میں ایک گونا جمنی اور گوناگو کیفیات پائی جاتی ہیں ایک غزل کے تین اشعار جو ذیل میں دیئے جا رہے اس حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔

ہمیں دنیا بہت پیاری نہیں ہے
سو اب تک زندگی واری نہیں ہے
مری آنکھوں میں کتنے رتجگے ہیں
مری آنکھ میں بیداری نہیں ہے

عابدہ کرامت کا شعری اسلوب اور افکار بے تکان نوعیت کے ہیں جس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مضبوط شخصیت کی مالک ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اعتماد کے ساتھ گلشنِ شعر

کی آبیاری کر رہی ہیں ان کے مذکورہ مجموعہ میں تاثرات و آرا معدوم ہیں ان کے ہاں ایک عصری کرب ہے جو ان کے اشعار میں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کے باعث اُن کی حزنیہ شعری طبع مجبور نوا ہو جاتی ہے لیکن اُن کے ہاں تلخ حقائق کو تسلیم کرنے کا وصف موجود ہے مگر اُن کے شعری مخزن میں حیرت و استعجاب کا ایک جہان آباد ہے ایک تجسس کی فضا ہے جو قاری کو اپنی اور کھینچے چلی جاتی ہے اُن کی غزل کے دو اشعار دنیائے شعر کے متوالوں کی ضیافتِ طبع کے لیے پیشِ خدمت ہیں ۔

کیوں آنے والی نسل میں در آئیں وحشتیں؟
اپنے ہی بچے ہم کو ڈرانے بہت لگے

کیا واقعی نوشتۂ دیوار ہم ہوئے؟
اربابِ اختیار مٹانے بہت لگے

فکری وفنی بالیدگی اُن کے سخن کا طرۂ امتیاز ہے عروضی محاسن کا اہتمام بخوبی ملتا ہے انہوں نے زیادہ تر مرکب بحور میں احسن طریقے سے سخن سنجی کی ہے مذکورہ توضیحات اس امر کی غماز ہیں کہ اُن کے افکار ہمہ جہت نوعیت کے ہیں مصرع در مصرع شعر در شعر غزل در غزل بین السطور ایک پہلو داری اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے جس سے ایک تازہ کاری کا احساس نمو پاتا ہے تواتر سے شعری ریاضت عابدہ کرامت کے ادبی مقام و مرتبے کو مزید اُجاگر کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ۔

☆☆☆☆☆

عابدہ کرامت (کراچی)

ہزار راہ ہو مشکل سفر تو ہوتا ہے
رفاقتوں میں یہ مد و جزر تو ہوتا ہے

کھلا بہار میں یا خزاں میں اجڑا ہو
بریدہ شاخ سہی وہ شجر تو ہوتا ہے

حروفِ طنز کا یا تند و تیز لہجوں کا
ذرا سی دیر سہی کچھ اثر تو ہوتا ہے

ہو صحن کچا کہ ٹوٹی ہوئی ہوں دیواریں
نصیب سایہ اگر ہے تو گھر تو ہوتا ہے

بہت بڑی ہے یہی ایک حق کی سچائی
ہو تلخ کتنا ہی پر معتبر تو ہوتا ہے

چراغ اپنا بچاؤں نہ کیوں ہواؤں سے؟
کہ طاقِ شب میں جلا رات بھر تو ہوتا ہے

عابدہ کرامت (کراچی)

اس زمیں سے نہ زماں سے خالی
میں ہوں سرمایۂ جاں سے خالی

اب کوئی درد نہ زخموں کی چبھن
روح ہے سوزِ نہاں سے خالی

یہ تو اک خواب ہے تعبیر نہیں
پاؤں زنجیرِ گراں سے خالی

اُس کی باتوں کا یقیں کیسے ہو؟
کام لیتا ہے زباں سے خالی

حرف و آواز میں الفاظ کہاں؟
کام چلتا ہے بیاں سے خالی

زندگی کیوں نہیں ہونے دیتی؟
جسم کو سود و زیاں سے خالی

سارے اسباب اُسے دے آئے
ہم نکل آئے مکاں سے خالی

عنبرین حسیب عنبر کی عمیق حسیات کی حامل شاعری

شاعری حسیات کے توسط سے شعور وآگہی کی بازیافت سے موسوم ہے یا مرِدیدنی ہوتا ہے کہ اس حوالے سے لاشعور اور شعور کس حد تک ممدو معاون ثابت ہوتا ہے اگر فطری وغیر فطری عوامل کی مکمل کرم فرمائی شاملِ حال ہو تو سخن ور کے ہاں عمیق حسیات کا ورود ہوتا ہے جس شاعر کے افکار کا تعین عام قاری کی ذہنی سطح سے بالاتر ہو تو اس کا کلام عمیق حسیات کے اوصاف کا حامل ہوتا ہے فنِ شاعری کا یہ وصفِ حمیدہ مشتے از خروارے کے مصداق معدودے چند شعراء وشاعرات کے ہاں ضوپاش ہوتا ہے انہیں بالیدہ فکر ہستیوں میں ایک نام عنبرین حسیب عنبر کا بھی ہے جنہیں فکر وفن اور ذوق وشوق کی دھن ورثہ میں ملی جنہوں نے ایک علمی وادبی خانوادے میں چشم کھولی ان کے والد گرامی سحر انصاری دنیائے ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں اور اس پر طرہ سید حسیب احمد جیسے ادب دوست آدمی ان کے شریکِ حیات ہیں گویا انہیں بھرپور نوعیت کی ادبی فضا میسر ہے کراچی کے ادبی حلقوں میں انہیں بے پناہ مقبولیت وپذیرائی حاصل ہے علاوہ ازیں ''اسالیب'' کے نام سے ایک سہ ماہی ادبی جریدہ بھی کراچی سے ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے شذرہ ھذا میں ہم اُن کے شعری مجموعہ مطبوعہ 2012ء ''دل کے افق پر'' کے نصف اول کے منتخب غزلیات کے منتخب اشعار عمیق حسیاتی تناظر میں شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔

عنبرین حسیب عنبر کے افکار میں توکل واستغنا سے مملو جذبے فرطِ تسلسل کے ساتھ پائے جاتے ہیں جن سے جذبوں کی شدت وحدت کی غمازی بھی ہوتی ہے انہوں نے اپنے سخن میں

صنعتِ تلمیح کو بھی بکثرت برتا ہے جس سے ان کے بسیط تاریخی وتہذیبی شعور کی عکاسی ہوتی ہے ان کے اشعار کے پردے میں زندہ دلی کے مظاہر بھی ضوپاشیاں کر رہے ہیں مصرع در مصرع، شعر در شعر، غزل در غزل بین السطور ایک عمیق حسیاتی فروغ کارفرما ہے اسی حوالے سے اُن کی ایک غزل کے پانچ اشعار در القفات پر دق الباب کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔

اک کلی کی خوشبو سے رسم و راہ کافی ہے
لاکھ جبر موسم ہو یہ پناہ کافی ہے
نیتِ زلیخا کی کھوج میں رہے دنیا
اپنی بے گناہی کو دل گواہ کافی ہے
عمر بھر کے سجدوں سے مل نہیں سکی جنت
خلد سے نکلنے کو اک گناہ کافی ہے
آسماں پہ جا بیٹھے یہ خبر نہیں تم کو
عرش کے ہلانے کو ایک آہ کافی ہے
چار دن کی بستی میں ہنس کے جی لیے عنبر
بے نشاط دنیا سے یہ نباہ کافی ہے

سخن عنبر کا یہ وصف عالیہ ہے کہ مشکل و نادر النظیر ردیفیں اور قوافی کا استعمال چابکدستی سے ملتا ہے عمدہ تراکیب کا برتاؤ بیان کی دلکشی بڑھا رہا ہے رفعتِ تخیل کی وجہ سے ایک فکری دقیقہ سنجی مشاہدہ کی جا سکتی ہے اسلوبیاتی حوالے سے بھی اُن کا کلام لطف امیزی کی کیفیت رکھتا ہے لسانی اعتبار سے ایک قرینہ کاری کا ہنر آشکار ہوتا ہے من حیث المجموع معاملات میں ان کا عمیق حسیاتی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔

سنجیدگی کے پیرائے میں اُن کے ہاں بذلہ سنجی کے شواہد بھی جلوہ ریز ہوئے ہیں جن میں ایک فلسفیانہ فکر کی جلوہ آرائی اور قوتِ متخیلہ کی معرکہ آرائی نمو پاشیاں کر رہی ہے رومانوی حوالے

سے اُن کے اشعار میں ایک معاملہ بندی کا حسن پایا جاتا ہے اسی نسبت سے اُن کی ایک اور غزل کے دو اشعار قدیم سخن کے متوالوں کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں ۔

اک عمر کے عذاب کا حاصل وہی بہشت
دو چار دن جہاں پہ گزارا نہیں کیا
اب ہنس کے تیرے ناز اُٹھائیں تو کس لیے؟
تو نے بھی تو لحاظ ہمارا نہیں کیا

اُن کے مصرعوں کے فکری ربط و ضبط میں ایک کرشمہ کاری کا اعجاز نظر آتا ہے جس کی چمک دمک سے قاری دنیائے حیرت و استعجاب میں چلا جاتا ہے اُن کے تخیلات نئی، عامیانہ اور روایتی نوعیت کے نہیں ہیں اس لیے اُن کے سوچنے کا رنگ ڈھنگ جداگانہ اور منفرد ہے ذیل میں ایک غزل کے چار اشعار ہیں اُن کی ندرت امیزی دیدنی ہے ۔

چاندنی سے تصور کا در وا ہوا
تم سے ہوتی رہی گفتگو دیر تک
جاگ اُٹھے تھے قربت کے موسم تمام
پھر سجی محفلِ رنگ و بو دیر تک
دفعتاً اُٹھ گئی ہیں نگاہیں مری
آج بیٹھے رہو رو برو دیر تک
تم نے کس کیفیت میں مخاطب کیا؟
کیف دیتا رہا لفظ تو دیر تک

عنبرین حسیب عنبر کے شعری کینوس میں آموزگارئ حیات کے رموز بھی انتہائی عمیق اور فکر انگیز انداز میں ملتے ہیں اُن کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں ۔

یہ دوڑ بھی عجیب سی ہے فیصلہ عجیب تر

ہے فاتحِ حیات وہ جو گر کے پھر سنبھل گیا

عنبریں حسیب عنبر کے کلام کے ناقدانہ مطالعہ و مشاہدہ سے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ فنِ شعر کے حوالے سے اُن کی حسیاتی صلاحیتوں نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا مگر انہیں اپنے معیار کو برقرار رکھنے اور آگے لے جانے کے لیے مزید معتبر اور طویل المیعاد راہنمائی کی اشد ضرورت ہے تا کہ ان کے اسرار و رموز اُن کے لیے آغوش کشا نظر آئیں اور شعری حوالے سے کچھ بنیادی مسائل سے رستگاری پائیں۔

☆☆☆☆☆

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اُردو سخن ڈاٹ کام

عنبریں حسیب عنبرؔ (کراچی)

ہے مسلسل جو تضادِ خیر و شر دیکھے گا کون؟
آج بھی نوکِ سناں پر ہیں جو سر دیکھے گا کون؟

میں نے تزئینِ چمن کی جستجو کی ہے سدا
یہ کبھی سوچا نہیں برگ و ثمر دیکھے گا کون؟

بے حسی کی دھند یوں چھائی ہوئی ہے چار سو
زندگی کی سمت اب بارِ دگر دیکھے گا کون؟

کل کے سورج سے تو ساری خلق ہے سہمی ہوئی
دیکھنا یہ ہے کہ اب خوابِ سحر دیکھے گا کون؟

غیر کی دیوار گرنے کے تماشائی ہیں سب
اب یہاں اپنے شکستہ بام و در دیکھے گا کون؟

عنبرین حسیب عنبرؔ (کراچی)

تمہارے ساتھ گئی جو خوشی نہیں آئی
پھر اس کے بعد لبوں پر ہنسی نہیں آئی

بچھڑتے وقت بہت زعم تھا اُسے خود پر
مری بھی آنکھ میں بالکل نمی نہیں آئی

تمہاری چشم تغافل نے کہہ بھی دی مجھ سے
جو بات لب پہ تمہارے ابھی نہیں آئی

تھی اپنے آپ سے ملنے کی آرزو جس میں
تمام عمر وہی اک گھڑی نہیں آئی

مرا یہ دل ہی جہاں ساتھ دے نہیں سکتا
میں اُس مقام پر عنبرؔ کبھی نہیں آئی

فہمیدہ ریاض کی نظم اور غیر روایتی تخیلات

دنیائے شعر بہت گنجان آباد ہے۔ آوازوں کے اس ہجوم میں جہاں آواز کے دب جانے کا قوی امکان ہوتا ہے، وہاں اپنی ایک منفرد پہچان رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جس کے لیے روایت وجدت کا تعین ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپ اپنے فن میں ندرت نہیں پیدا کر سکتے۔ غیر روایتی تخیلات کے لیے ضروری ہے کہ اسلوب میں بھی جدت کے مظاہر موجود ہوں۔ بے جان اور سپاٹ قسم کا اسلوب نہ ہو۔ فہمیدہ ریاض ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنے افکار کی بدولت دنیائے شعر وسخن میں ایک نمایاں مقام پایا ہے، جن کے اسلوب میں غیر روایتی اسلوب اور احساسات شامل ہیں۔ اُردو زبان اپنے اندر لاتعداد فارسی وعربی الفاظ سموئے ہوئے ہے۔ مذہبی تعصبات کے باعث ہندی الفاظ کا چلن عربی وفارسی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مرورایام کے ساتھ ساتھ میڈیا کی ترقی کے باعث لسانی رواداری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے جس کے باعث ہندی لفظیات کو اُردو میں جگہ دی گئی۔ فہمیدہ ریاض ان معدودے چند ابتدائی لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اُردو میں ہندی کے اثر کو قبول کیا۔ قبل ازیں فگار تونسوی نے بھی ہندی لفظیات کو انتہائی قرینے سے برتا اور ہندی تہذیب وتمدن کے خدوخال اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی اور فہمیدہ ریاض نے اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعی جمیل کی ہے۔ ان کے ادراکات میں ایک عمیق عرفانی اور تہذیبی شعور ملتا ہے، کچھ تلخ شواہد بھی ہیں جو ان کے تجربات ومشاہدات کا حاصل ہیں۔ ان کی شاعری دنیائے سخن کے سنجیدہ قاری کو زیادہ متاثر کرتی ہے کیوں کہ ان کے ہاں نجی اور سطحی الفاظ وجذبات کا فقدان ہے۔ ان کا اسلوب دقیقہ سنجی کا مظہر ہے، یہ دقیقہ سنجی لسانی اور فکری دونوں حوالوں سے ہے۔ اس شذرے میں ہم ان کے شعری مجموعہ ''دھوپ'' مطبوعہ 1976ء کی منتخب نظموں کے اقتباسات شامل تجزیہ کرتے ہیں۔

ان کے موضوعات میں جدت وشدت کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جو کسی تخلیق کار کی پذیرائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا سخن قلب وفکر پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔ ان کے موضوعات میں سماجی بے حسی، عصری کرب اور شدید نوعیت کا احساس تنہائی ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنہائی کی اذیت کتنی قیامت خیز ہوتی ہے۔ اگر چہ انہوں نے اسے ذاتی حوالے سے پیش کیا ہے لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ عصرِ حاضر کے انسان کا اجتماعی مسئلہ بھی ہے جس کے اسباب میں مذہبی عوامل شامل ہیں جو نسلی بے راہ روی کو فروغ دیتے ہیں۔ وہ ایک پر آشوب عہد کی نمائندہ ہیں، آشوب زدگیوں کا عکس جمیل ان کے کلام میں جا بجا جلوہ سامانی کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''رات تلملاتی ہے'' کا نمونہ اوّل دیکھتے ہیں۔

رات تلملاتی ہے
بے بسی کے پنجے میں
ہنستی غصیلی رات
پنکھ پھڑ پھڑاتی ہے
میری کوکھ میں ہر آن
پل رہا ہے سناٹا
اور میری تنہائی
چوستی ہے سینے سے
گرم دودھ کا دھارا

ان کی منظومات میں تسلسل اور ربط وضبط پایا جاتا ہے، ان کے خیالات قاری کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں جس کے باعث وہ کئی طرح کی دلچسپیوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

ان کا پیرایۂ اظہار غیر معمولی اور سوچ غیر روایتی ہے جو اپنے اندر ایک نئی فضا رکھتی ہے ان کے پاس ایک دعوتِ غور وعمل ہے اور تحرک کے اثرات ہویدا ہیں۔ وہ سماج میں محبتیں بکھیرنا چاہتی ہیں، وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے جذبۂ الفت سے سرشار ہیں۔ ان کی نظم کے دو مصرعوں میں فکری

رابطہ دور اندیشی کا غماز ہے۔ ان کی نظم ''پتھر کی زبان'' میں ان کے تلخ اور عمیق مشاہدات کی جھلک دیکھتے ہیں نظم کا مثلثِ اوّل ملاحظہ کریں۔

پتھروں پر دمکتا اکیلا لہو
جھلملاتا لہو بہہ رہا ہے
میرے بیٹے یہاں دیدہ ور کون ہے؟
جو نظارہ کرے
دامنِ کوہ میں
کیسے چمکے ہیں یاقوت و مرجاں
ہم وطن تو کوئی سننے والا نہیں
پتھروں نے سنیں
کرب کی سسکیاں
آخری ہچکیاں

ان کی نظموں میں احساسِ یگانگت بھرپور نوعیت کا ہے جس کے باعث ان کا شدید نوعیت کا احساسِ خلوت ہے۔ جہاں جسمانی اور روحانی آسودگیاں میسر نہیں ہیں۔ حوالے کے طور پر ہم نے ان کی صرف دو نظمیں شامل کیں اور طول بیان سے کام نہیں لیا تا کہ قارئین کی طبع نازک ملحوظِ خاطر رکھا جائے تا کہ ان کی دلچسپی فہمیدہ ریاض کے فکر و فن سے وابستہ رہے۔ ان کے ہاں ایک احساس پنائیت کے ساتھ ساتھ ایک احساس اجنبیت بھی جلوہ افروز ہے جو عصری مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ فہمیدہ ریاض نے اپنے عہد کو متاثر کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور قاری ان کے سخن سے بہت کچھ مستفید ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فہمیدہ ریاض (کراچی)

گرہستن

سنگیت کے دائرے بناتی ہوئی چال
آنگن سے رسوائی کی طرف جاتی ہوئی
اک ہاتھ دھرے کمر کی گولائی میں
چٹکی میں سارا کام نبٹاتی ہوں

ہنستا بالک ہری بھری گود میں
سکھ چین سہاگ کا سبھاؤ میں رچا
ہونٹوں پہ چٹکتے ہیں رسیلے بوسے
سب تن سے چھلکتی ہوئی جیون مدرا

گھر کی بیوہار میں سویرے سے لگی
چہرے پہ تھکاوٹ کا کہیں نام نہیں
گدرائے بدن میں ہے جوانی کا تناؤ
پربت بھی کاٹ دے تو کچھ کام نہیں

دوجے کو تاکتی ہے چنچلتا سے
لمبی چوٹی کمر پہ بل کھاتی ہے
ہنستی جاتی ہے چلبلاہٹ سے بھری
ساجن کو جھلک دکھا کے اکساتی ہے

دیکھو تو سہاگنی کے مکھڑے کی دمک
اپنے پریتم کی آنکھ کا تارا ہے
جیون کھیتی کو سینچتی جائے گی
امرت کی ندی کا رس بھرا دھارا ہے

فہمیدہ ریاض (کراچی)

ایک کتاب

یہ کیسا جگ مگ سونا ہے؟
ان حرفوں میں
ان لفظوں میں
یہ کچا سونا، جس کی ڈمک سے میرے نین دمک اُٹھے
میرے تاریک لہو میں کیسا اندر اجالا در آیا؟
اور سارے تن میں پھیل گیا
یہ کیسی کچی سانسوں کی گرمی سے کتاب پگھلتی ہے؟
یہ کس دل کی دھڑکن، دھک دھک
میرے دل سے ٹکراتی ہے
میں کان لگا کر سنتی ہوں دروازے پر کیسی دستک؟

اس گھر میں تو اندھیارا تھا

پھر کون جھروکہ کھلتا ہے؟

یہ کہاں سے آئی چندر کرن؟

جس سے روشن سارا آنگن

میرا دل ایسے چونکا ہے

حیرت سے آنکھیں بھر آئیں

یہ آنسو پیار کا آنسو ہے

یہ آنسو اجلا آنسو ہے

اس آنسو میں تو ہنستا ہے

وہ کچا سونا

جس کی ڈمک سے میرے نین دمک اُٹھے

ڈاکٹر فاطمہ حسن کے فکری زاویے

کسی بھی سخن داں کی تخلیقی وسعت کو اس کے فکری زاویے متعین کرتے ہیں اس کے افکار کی رنگارنگی اور بوقلمونی اس کے فکری کینوس کی غمازی کرتی ہے اگر تخیلات عمومی اور فطری نوعیت کے ہیں تو اس سے یہ عکاسی ہوتی ہے کہ اس کے فکری ارتقا کا عمل جامد و ساکت ہے اگر اس میں تغیراتی شواہد بکثرت ہیں تو اس کے فکری زاویے نہ صرف عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں بلکہ لائق التفات وصد تحسین وصد ستائش ہیں اسی نوع کے فکری تغیرات اور زاویے طبقۂ اناث کی شاعری میں بھی خال خال ضوپاش ہوئے ہیں مذکورہ تاثرات فاطمہ حسن کے شعری مطالعے سے اقلیم خرد پر جلوہ ریز ہوئے ہیں فاطمہ حسن کا تعلق دبستان کراچی سے ہے اب تک ان کے متعدد شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں جو علمی وادبی حلقوں سے پذیرائی اور شہرت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں شخصی اعتبار سے ان کے مزاج میں ایک وضع داری اور طنطنہ پایا جاتا ہے جو ایک اعتمادی فضا کی ترجمانی ہے مگر کہیں کہیں انہیں انتہائی بے تکلفی مرغوب ہوتی ہے آج ہم ان کے تیسرے شعری مجموعہ "یادیں بھی اب خواب ہوئیں" کے تقریباً نصف اول کے منتخب غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرنے کی سعی جمیل کرتے ہیں مجموعہ ھذا کا نام بیک وقت عمومیت اور ندرت کا مظہر ہے روایتی سوچ اور طرفہ طرز فکر کا غماز بھی ہے کتاب ھذا میں "جنگل کا شور" اور "چھتری" کے نام سے فہمیدہ ریاض اور ثمینہ راجہ کی آرا ثبت ہیں اس کتاب میں جہاں حمد و نعت اور سلام کے جواہر ہیں وہاں غزل، آزاد نظم اور ہائیکو کے حسین رنگ نکہت بیزیاں کر رہے ہیں ان کی غزل تغزل کی دولت سے مالا مال ہے۔

فاطمہ حسن کی شعری اپچ کا وصفِ جمیل یہ ہے وہ روایت وجدت کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں ان کے ہاں افراط وتفریط نہیں کسی ایک سمت فکری جھکاؤ دیکھنے میں نہیں آتا جس سے اُن کی متوازن فکری شخصیت نمویاش ہوتی ہے بنی نوع انسان کی آفرینش سے ہی حالات نامساعد رہے ہیں گویا اس میں ایک ہمہ گیری کا پہلو کارفرما ہے اس پرآشوب سنسار میں انسان نے ہر عہد میں شدید نوعیت کے احساسِ اجنبیت کو محسوس کیا ہے یہی سبب ہے کہ انسان ہر دور میں شدید قسم کے احساسِ تنہائی سے دوچار رہا ہے اسی فکری پرچھائیاں فاطمہ حسن کے افکار میں بھی مشاہدہ کی جاسکتی ہیں اور ایک مستقل نوع کے ہمسفر کی انتہائی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے بقول راقم الحروف ۔

رنجکوں کا مجھے ہمسفر چاہیے
چارہ جو چاہیے چارہ گر چاہیے
جو مرا ساتھ دے میرے ہر حال میں
ایسا کوئی حبیبِ نظر چاہیے

ان کی غزل کے ایک شعر میں جس میں احساسِ خلوت نمایاں ہے زیبِ قرطاس ہے ۔

دیکھ مجھ سے باتیں کرتے رہنا تم
تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے

زیست کی بے ثباتی کا مذکور بنی نوع انسان کا ایک کلاسیکی رویہ ہے جسے ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے بقول کسے ۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

یہی فکر فاطمہ حسن کے ہاں خودآموزی کے انداز میں جلوہ ریز رہی ہے ۔

کیوں سوچ رہی ہوں کل کی باتیں؟

کیا کوئی ابد تلک جیا ہے؟

جمالیاتی اقدار یا احساسات حسنِ زیست کو فروغ سے ہمکنار کرتے ہیں جن کی بدولت بعض حیات تپش آمادہ رہتی ہے ایسے جذبے ہستی ناپائیدار کو تنگ و تاز سے مرصع کرتے ہیں یہ تخیلات ہر عہد میں اعتبارِ ذوق ہوا کرتے ہیں جن کی بدولت زندگی کی چکا چوند برقرار رہتی ہے ایسے جذبوں کے کئی حوالے ہیں جن کو معرفت و مجاز کے کلیدی تلازمات میں منقسم کیا جاتا ہے معرفت کا حوالہ تصوف کی دلیل گردانا جاتا ہے اس کی ایک عمدہ تمثیل فاطمہ حسن کے ہاں ملاحظہ کرتے ہیں۔

یہ ہنر بھی اس کا کمال ہے یہ اس کا عکس جمال ہے
مرا آئینہ جو وہ بن گیا مرے خدوخال سنور گئے

حیات انسانی کچھ قربانیوں کی متقاضی ہوتی ہیں اور جو کوئی اس نوع کے اوصافِ حمیدہ سے مسجع ہو وہ انسان دوستی کا آئینہ دار اور علمبردار ہوتا ہے ان خصوصیات سے متصف ہونے کے لیے پربت کا جگر چاہیے اور چٹانوں کا حوصلہ بھی۔ اگر اولعزمی و مساز ہو تو تمام معرکے باآسانی سر ہوتے ہیں جب انسان اپنے ماحول میں محبتیں اور مروتیں بکھیرتا ہے تو معاشرت میں خلوص و موافقت کی فضا پیدا ہوتی ہے اور دنیا بہشت کی مثیل نظر آتی ہے اصل مطمعِ نظر تو یہ ہے کہ زندگی کے تقاضے پورے ہوں بالغرض کیا کھویا کیا پایا۔ حیات پرخطر کے پرکٹھن سفر میں جہاں ہجرتوں کا کرب بھی مہیب صورت کا حامل ہوتا ہے اس اذیت کو جھیلتے جھیلتے انسان بھیڑ میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے یہ عوامل ان کے شعری کینوس میں بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔

اپنے پیاروں کو بچایا درد کی ہر موج سے
آنکھ میں سیلاب روکا دل کو دریا کر دیا
پھول ، پودے ، پیڑ بچے اور تم
خواہشوں کے نام پر ان سب کو یکجا کر دیا
ہجر سے ہجرت تلک ہر دکھ سے سمجھوتا کیا

بھیڑ میں رہ کر بھی میں نے خود کو تنہا کر دیا

مرورِ ایام نے جو انسانی معاشرت پر بھیانک اور انمٹ اثرات مرتب کیے ہیں وہ اخلاقی اقدار کا نوحہ پیش کرتے ہیں حالات کی واژگونی باعثِ بے سکونی ہے یہی تغیرات ناگفتہ بہ صورتِ احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں ایک گہری حساسیت رکھنے والا فرد بلبلا اُٹھتا ہے یہی احساسات فاطمہ حسن کی حسیات کا حصہ ہیں۔

جاتا ہے جو گھروں کو وہ رستہ بدل دیا
آندھی نے میرے شہر کا نقشہ بدل دیا

سماجی روایات جب روبہ زوال ہوتی ہیں عمرانی ادراکات کو ٹھیس پہنچتی ہے تو پھر حیاتِ انسانی میں ایک بیزاری کا عمل شروع ہو جاتا ہے زیست کی رونقیں اور رعنائیاں اپنی بساط لپیٹ لیتی ہیں احساسِ جمال کو گزند پہنچتا ہے پھر انتشارِ ذات، تحلیلِ نفسی، فکری خلفشار، زیست کی بے رنگی اور بے ضابطگی انسان کو اپنے احاطۂ قدرت میں لے لیتی ہے اسی حوالے سے ان کے کارزارِ خیال کا رنگ دیکھتے ہیں۔

نہیں ربط اب کسی بات میں
عجب انتشار ہے ذات میں

القصہ مختصر فاطمہ حسن کے فکری و فنی گوشوں کی سیر ہو کر سیر کرنے کے بعد یہ انکشاف انتہائی قوی ہے کہ ان کے شعری مخزن میں بے پناہ فکری زاویے ہیں جو اپنے قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتے ہیں اور اُسے قابلِ تسکین اور قابلِ اطمینان امکانات بہم پہنچاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر فاطمہ حسن (کراچی)

اک چکور اُڑتا ہے چاندنی کے گھیرے میں
کس قدر اُجالا ہے رات کے اندھیرے میں؟

جھیل پر اترتے ہیں جھنڈ کچھ پرندوں کے
سردیاں گزاریں گے عارضی بسیرے میں

پھول بھیگے بھیگے ہیں پات نکھرے نکھرے ہیں
لوٹ کر وہ آیا ہے شبنمی سویرے میں

جرم ہے جنوں ہے عشق، اعتراف کرتی ہوں
قید خود کو رکھا ہے وحشتوں کے گھیرے میں

کوئی جا کے دیکھے تو کون منتظر ہے اب؟
اک چراغ جلتا ہے دور ایک ڈیرے میں

ڈاکٹر فاطمہ حسن (کراچی)

روشنی بار تھی جو پلکوں پر
سو گئی ہاتھ رکھ کے آنکھوں پر

ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے
لفظ کوئی نہیں ہے ہونٹوں پر

آئینے میں بھی عکس ان کا ہے
اس کی نظریں ہیں اپنے بچوں پر

اور مفہوم ان کو دے دیں گے
رکھنا قابو ہمیشہ لفظوں پر

دیکھنا پھول کھل اُٹھے شاید
ایک تتلی اُڑی ہے پیڑوں پر

یہ مسافر کہیں تو ٹھہریں گے
کون چلتا رہے گا رستوں پر؟

شعر تو مضطرب پرندہ ہے
کب ٹھہرتا ہے اپنے معنوں پر؟

فاخرہ بتول کی فکری عمومیت

ہر شاعر یا ادیب کے تخلیقی اظہار کی افریشن عمومیت کے پہلو میں ہوتی ہے جس سے عمومیت اور روایت کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے کچھ تخلیق کاروں کے ہاں شعوری یا لاشعوری طور پر جدت کے مظاہر نمو پاش ہوتے ہیں لیکن جو قلم کار شعوری یا کسی طور پر ندرت کی بازیافت کے لیے کوشاں نہیں رہتے ان کا طرزِ اظہار عمومی نوعیت کا حامل ہوتا ہے آج ہمارا موضوع شذرہ فاخرہ بتول کی فکری عمومیت ہے ان کا اٹھواں شعری مجموعہ ''گلاب خوشبو بنا گیا ہے'' مطبوعہ ستمبر 2004ء ہمارے پیشِ نظر ہے مذکورہ مجموعہ کے نصف اول کے منتخب غزلیہ اشعار متذکرہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ ہیں فاخرہ بتول کا تعلق راولپنڈی شہر سے ہے وہ عرصہ دراز سے یہیں مقیم ہیں۔

فاخرہ بتول کے افکار کی بہت بڑی خصوصیت اور عمدگی یہ ہے کہ ان کی فکری عمومیت عامیانہ پن سے مبرا و ماورا ہے سطحی اور نجی خیالات کا اظہار بھی دلچسپی کے پیرائے میں ہوتا ہے جس سے تخیلات پر ماورائیت طاری ہونے کا گماں گزرتا ہے روایت سے ان کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے اس لیے عہدِ ماضی کی ساعتوں کی بازیافت ان کے ہاں بھرپور انداز میں ملتی ہے خلوص و محبت اور اتفاق کا بلیغ آدرش ان کے ہاں پورے کروفر سے پایا جاتا ہے اخلاقی اقدار کا نوحہ پر سوز اور جاں گداز کیفیت میں ان کے اشعار سے مترشح ہو رہا ہے انہوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے مفرد و مرکب اور رواں دواں بحور کا انتخاب کیا ہے ان کا اسلوب سہلِ ممتنع کی خصوصیت رکھتا ہے ورلسانی اعتبار سے جاذبیت سے مرصع ہے ان کی ایک غزل کا ایک شعر دردِ دل پر دق الباب کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

گھر کو بنانے والا تو مٹی میں سو گیا

حصے جو بٹ گئے تو کوئی یاد آ گیا

فکری عمومیت کی آئینہ دار ان کی ایک پوری غزل بدونِ تبصرہ زیبِ قرطاس ہے۔

تم سے بچھڑ کے کام یہ کرنا پڑا ہمیں
پھر آج اپنے آپ سے لڑنا پڑا ہمیں
کچھ مانگنے کے واسطے آیا تھا اک فقیر
کاسے کو آج اشکوں سے بھرنا پڑا ہمیں
پہلے تو اک جہاں کے مقابل میں ڈٹ گئے
آخر میں اپنے سائے سے ڈرنا پڑا ہمیں
چاہت کا حادثہ ہی کہیں سانحہ نہ ہو
بے کار اس خیال میں پڑنا پڑا ہمیں
اک خواب کھوجنے کے لیے بارہا بتولؔ
ان نیند وادیوں سے گزرنا پڑا ہمیں

طبعی اور فکری اعتبار سے وہ بلند حوصلگی کی حامل ہیں وہ ہر طرح کے حالات میں شاکر و قانع رہتی ہیں نالہ وشیون حرفِ شکایت اور آہ وفغاں ان کے لیے کارِ بے زیبا نہیں مشیت نے انہیں بے پناہ دولت ضبط ودیعت کی ہے ان کے ہاں تامل وجابر اور ستمگر کے لیے بھی لبوں پر حرفِ دعا مچلتا ہے اسی فکر کی غمازی ان کی ایک غزل کے ایک شعر میں یوں برپائی گئی ہے۔

ذرا بھی نادم نہیں ہیں اس پر
جو شہرِ ہستی مٹا گیا ہے

فاخرہ بتولؔ کے کلام میں داخلی اظہار کے بے انت شواہد ضوپاشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں انھیں داخلی احساسات کے پردہ میں ان کے بے پناہ ذاتی حوالے پنہاں ہیں گویا داخلیت بھی پوری شان وشوکت کے ساتھ ان کے ہاں جلوہ گر ہے اس حوالے سے ان کی ایک غزل کا ایک شعر

دیدنی ہے۔

یہ کائنات تو پیچھے ہی رہ گئی تھی کہیں
ہجومِ ذات سے تو راستہ نہ ملا

اُن کی فکری عمومیت طرفگی امیز ہے ان کا آدرش انتہائی بلیغ اور وسعتوں کا حامل ہے ان کا اسلوب ان کے تخیل کو ندرت امیز کرنے پر قادر ہے وہ عمومی فکر کو ایک خاص انداز میں زیبِ قرطاس کرتی ہیں۔

پوچھا تمام خواب کے منظر بھلا دیئے
آیا جواب قید سے پنچھی اُڑا دیئے
پوچھا وہ ساحلوں کی کہانی کا کیا بنا؟
بتلایا سارے نقش ہوا نے مٹا دیئے

الغرض فاخرہ بتول کے فکری وفنی گوشوں کی سیر حاصل سیر کے بعد یہ انکشاف حد تیقن کو پہنچتا ہے کہ ان کی فکر ایک زبردست نوع کی عمومیت رکھتی ہے جو براہ راست قاری کی تفہیم خرد پر اپنے نقوش ثبت کرتی ہے مزید شعری ریاضت ان کے لیے فزوں تر معیارات کی ضمانت ثابت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

فاخرہ بتول (راولپنڈی)

جو سوا نیزے پہ سورج کے نکلتا ہوگا
اُس کا سایہ بھی کڑی دھوپ میں جلتا ہوگا

یونہی تو پلکوں پہ یاقوت نہیں آویزاں
کچھ تو ہے جو مرے سینے میں پگھلتا ہوگا

نت نئے رنگ کے پھولوں میں جو آتا ہے نظر
وہ تو موسم بھی نہیں کیسے بدلتا ہو گا؟

درد ہے دل کا مکیں اس کو نکالے بھی تو کون؟
یہ بھی موتی کی طرح سیپ میں پلتا ہو گا

نت نئی آگ میں ہر روز جلاتا ہے جو شخص
ہاتھ اُس کا بھی تو اس کھیل میں جلتا ہوگا

فاخرہ بتولؔ (راولپنڈی)

دیکھا تو سب خیال کے منظر بدل گئے
یعنی ہمیں نکال کے منظر بدل گئے

تیرہ شبوں کے زہر میں لپٹے ہوئے سے خواب
جھولی مری میں ڈال کے منظر بدل گئے

جس پل فراق خون کا سرطان بن گیا
وہ لمحے وہ وصال کے منظر بدل گئے

اقرار کے مقام پہ وہ جب مکر گیا
افکار کو سنبھال کے منظر بدل گئے

مٹھی میں خواب یادوں کی کچھ راکھ سی بتولؔ
میری طرف اچھال کے منظر بدل گئے

فرحؔ اقبال کا کلام اور جوابی رویے

حیات انسانی پر عصری مقتضیات اور عصری مزاج گہرے نقوش ثبت کرتا ہے جن سے روحِ عصر کی ترجمانی ہوتی ہے اس حوالے سے عصری رویے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں ردِ عمل کے طور پر جو رویے نمو پاش ہوتے ہیں انہیں جوابی رویوں سے موسوم کیا جاتا ہے جس سخنور کے ہاں یہ رویے خطیر انداز میں پائے جائیں اس کے کلام میں مزاحمت کے شواہد بھی آشکار ہوتے ہیں جراًت و جسارت بھی جلوہ ریزیاں کرتی دکھائی دیتی ہے طبقۂ اناث کی سخن گستری سے یہ عوامل بہت کم ہی ہویدا ہوتے ہیں شذرہ ہٰذا میں آج ہمارا موضوعِ بحث فرحؔ اقبال کے کلام میں موجود جوابی رویے ہیں ان کے مجموعۂ کلام ''دل کے موسم'' مطبوعہ 2007ء کے ثلث اول کے منتخب غزلیہ اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ کرتے ہیں۔

فرحؔ اقبال کا بنیادی تعلق پنجاب سے ہے ان کی نسبت ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے علم و ادب کا ذوق ان کو ورثے میں ملا ان کے والدِ گرامی محمد نعیم تاج متعدد کتب کے مصنف تھے ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ کی حیثیت سے حکومتِ پنجاب سے ریٹائر ہوئے فرحؔ اقبال نے دورانِ تعلیم پاکستان کی قومی ایئر لائن میں بھی اپنی خدمات سر انجام دیں جس کے باعث انہیں دنیا کی سیر و سیاحت کے مواقع بھی میسر آئے اور ان کے مشاہدات و تجربات میں بے پناہ اضافہ ہوا تادمِ تحریر ہیوسٹن امریکہ میں مقیم ہیں ان کی ایک پہچان مصوری بھی ہے ہیوسٹن کی اردو برادری کی علمی و ادبی و سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں انہیں نمایاں طور پر شرکت کرنے کا شرف حاصل ہے وہ پاکستان

ایسوسی ایشن آف گریٹر ہیوسٹن کی تعلیمی کمیٹی کی صدر ہیں اور پاکستان سینٹر ہیوسٹن میں ایک لائبریری قائم کرنے کا ایک خواب بھی رکھتی ہیں "بھولی بسری یادیں" کے نام سے ہیوسٹن میں ایک ریڈیو پروگرام بھی کرتی ہیں جسے وہاں کی معاشرت میں مقبولیت و پذیرائی حاصل ہے پرائے دیس میں اقامت پذیر ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اپنی پاک دھرتی سے اپنا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار رکھا اس لیے وہ اپنی تعطیلات گزارنے کے لیے پاکستان آ کر رہتی ہیں کراچی کی ادبی و سماجی زندگی خصوصاً آرٹس کونسل کراچی کی سرگرمیوں میں بھرپور انداز میں اپنی شرکت یقینی بناتی رہتی ہیں یہ ان کے سوانحی کوائف کی چند جھلکیاں تھیں جن کے لیے مذکورہ مجموعے سے استفادہ کیا گیا۔

جب زیست میں رونقیں اور رعنائیاں معدوم ہو جائیں اور ان کی جگہ مصائب و آلام لے لیں پھر تمام مسرتیں اور خوشگواریاں اپنی بساط لپیٹ لیتی ہیں پھر انسان زندگی سے مفر کی راہیں تلاش کرتا ہے جوابی رویے کے طور پر اسے اپنی ذات سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے کاکل ہستی مسائل میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

بقول راقم الحروف ؎

مجھے خود سے ملنے کی فرصت نہیں ہے
حقیقت میں خود سے محبت نہیں ہے
حیاتِ گریزاں سے کترا رہا ہوں
مجھے اور جینے سے رغبت نہیں ہے

جب انسان کے اندر اپنی ذات کا احترام ختم ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کا پر اذیت دور شروع ہو جاتا ہے مگر جب انسان عقلِ سلیم سے بہرہ ور ہو تو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جسارت رکھتا ہے تنقیدی رویوں کو فروغ ملتا ہے انہیں جوابی رویوں کی حامل احساسات سے مرصع فرح اقبال کی ایک غزل کے تین اشعار دیکھتے ہیں۔

زندگی بھی کچھ گریزاں ہم سے ہے
اور ہم کو بھی بہانہ چاہیے
جو سمجھتے ہیں حسیں خود کو بہت
آئینہ اُن کو دکھانا چاہیے
راہزن ہی قافلہ سالار ہے
قافلے کو یہ بتانا چاہیے

قدرت ایزدی نے اس پیکرِ خاکی کو ایسا طبعی نظام ودیعت کیا ہے جو اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی فطرت کے عین مطابق کام کرتا ہے یعنی انسانی ارادے کچھ بھی ہوں لیکن ایک فطری عمل جاری وساری رہتا ہے انسانی اعضا کا یہ جوابی عمل جوابی رویوں کا مثیل ہے جس کی عمدہ تمثیل یہ ہے کہ بسا اوقات انسان جھوٹ کو چھپانا اور دبانا چاہتا ہے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات جو خد وخال سے ہویدا ہوتے ہیں اور خصوصاً آنکھیں انسان کا اس تکذیب کے عمل میں ساتھ نہیں دے پاتیں انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں اس منفرد حقیقت کو یوں طشت ازبام کیا ہے۔

آپ جھٹلا دیں ہر اک بات لبوں سے لیکن
آنکھیں سچائی کا اعلان ہوا کرتی ہیں

اُن کے شعوری مخزن میں بنی نوعِ انسان کے لیے آموزگاری کے بے انت مظاہر ہیں بے حد و بے حساب جانکاری ہے اور انسانی سدھار کے لیے حقیقی زندگی کا عمیق شعور ملتا ہے ان کی ایک غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کریں۔

بابِ حیات کو نیا عنوان چاہیے
اگلے سفر کے واسطے سامان چاہیے

عصری آشوب زدگیوں، ستم ظریفیوں اور چیرہ دستیوں کے سبب خواہشوں کا ناپید ہو جانا، رنجگوں کا معدوم ہو جانا اور حسرتوں کا ماتم خیز ہونا ایک فطری امر ہے جسے ردِ عمل سے موسوم کیا

جا سکتا ہے کیونکہ جب خواہشیں پوری نہ ہوں تو پھر وہ حسرتوں کا روپ دھار لیتی ہیں اسی نوع کا داخلی اظہار فرحؔ اقبال کی ایک غزل کے ایک شعر میں کچھ یوں ملتا ہے۔

نہ ہیں خواہشوں کے موسم نہ ہیں رتجگوں کے موسم
مری آنکھ سے جھلکتی کسی خواب کی نمی ہے

اگر فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو فرحؔ اقبال کے ہاں عروضی تلازمات کا اہتمام بخوبی پایا جاتا ہے زیادہ تر انہوں نے مرکب بحور میں سخن گستری کی ہے ان کا اسلوب سہلِ ممتنع کی ردا اوڑھے جاذبیت کے رنگ کا حامل ہے جس کے باعث فطری اظہار کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

مذکورہ توضیحات اس امر کی عکاس ہیں کہ فرحؔ اقبال کے کلام میں جو فنی رویے بکثرت پائے جاتے ہیں جن میں عکس دوراں جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے روحِ عصر کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے اگر ان کی مشاطگیِ عروسِ سخن جاری رہی تو وہ کچھ مزید فکری و فنی معیارات کا اہتمام کر پائیں گی جس کی بدولت وہ دنیائے غزل میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

فرحؔ اقبال (کراچی)

بیتا ہوا کل جیسے کہ خوابوں کی طرح تھا
اس عمر کے صحرا میں سرابوں کی طرح تھا

وہ سایۂ گل تھا کہ بہاروں کی تمنا
تب چہرہ میرا جیسے گلابوں کی طرح تھا

اس بابِ دلِ شوق کے عنوان نہ دیکھے
وہ میرے لیے بند کتابوں کی طرح تھا

چھلکا ہے لہو آنکھ سے ہر لحظہ ہر اک پل
یہ ہجر بھی جیسے کہ عذابوں کی طرح تھا

جلتی ہوئی آنکھوں میں بھڑکتا تھا مرا عکس
وہ ایک نشہ کتنی شرابوں کی طرح تھا

فرح اقبال (کراچی)

ٹھہرے ہوئے ہیں کچھ پل اک اجنبی جہاں میں
ملتے رہے تھے ہم تم کسی اور کہکشاں میں

جھیلا ہے موسموں کو گزرے ہوئے دنوں میں
سہمے ہوئے ہیں پتے اس بار کی خزاں میں

ہوتے ہی شام جیسے اُڑتے ہیں سب پرندے
اڑ جائیں گے کسی دن ایسے ہی آسماں میں

ہیں تیر وہ چلاتے ہر بار دل پہ ایسے
کوئی روندتا ہو جیسے پھولوں کو گلستاں میں

وہ کر رہے تھے دعویٰ ہم سے محبتوں کا
پر وصل بھی نہ پایا اس ہجر کے گماں میں

فرزانہ جاناںؔ ایک رومان پرور شاعرہ

لفظ انسان عبارت ہے اُنس، پیار، موانست، چاہت، محبت اور پریم سے یہ ایک فطری جذبہ ہے جو پیکرِ خاکی کو ودیعت کیا گیا ہے اس جذبے کی پاسداری میں جو شید معاون ثابت ہوتے ہیں وہ نکات زریں افتخارِ ادب قرار پاتے ہیں اقلیم شعر و سخن انہیں کی بدولت مالا مال ہے بے شمار شعراو شاعرات نے اپنی نگارشات میں اس جذبے کی پیوندکاری کی ان میں فرزانہ جاناں کا نام نامی ممتاز و منفرد مقام رکھتا ہے اُن کا ایک شعری مجموعہ جو کہ "بزمِ جاناں" سے معنون ہے 2009ء میں زیرِ طباعت سے آراستہ ہوا اُن کی شعری ریاضت مسلسل جاری رہی اور اپنی کشید جاں سے "خواب زندہ ہیں" کے نام سے 2011ء میں دوسرا مجموعۂ کلام قارئین شعر و سخن کو مہیا کیا "بزمِ جاناں" سے "خواب زندہ ہیں" تک کا شعری ارتقا کا سفر اُن کی مشاطگیٔ فن کا غماز ہے آج ہم اُن کے انہی شعری مجموعوں کے تناظر میں رومان جو اُن کی شاعری کا مستقل و توانا حوالہ ہے اُس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم سب سے پہلے اُن کے اولین مجموعۂ کلام اور بزمِ جاناں سے اُن کی شاعری کے مستقل حوالہ کو آشکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیجیے جاناں کے پہلے شعری مجموعہ کی اولین غزل ملاحظہ کیجیے ۔

دوست کا اعتبار کرنا ہے
ہجر میں انتظار کرنا ہے

زیست میں مشکلیں تو آتی ہیں
پھر بھی ہنس ہنس کے پیار کرنا ہے
منتظر ہوں تمہاری آمد کی
شام کو خوشگوار کرنا ہے
زندگی میں رہی خزاں ہر دم
آ کے تم نے بہار کرنا ہے
جتنی مایوسیوں نے گھیرا ہے
میں نے اُن کو شمار کرنا ہے
مجھ کو تو اس سے ہو چکا جاناں
اُس نے کب مجھ سے پیار کرنا ہے؟

قارئین کرام آپ نے مشاہدہ کیا کہ جاناں نے کتنی خوبصورتی سے چھ اشعار کی اس غزل میں انتہائی سادگی سے محبت کی عمومی کیفیات کا برملا اظہار کیا ہے شعرِ اول میں وہ اعتبار اور امید کا درس دے رہی ہیں اور نہایت ہی پرعزم انداز میں فرما رہی ہیں کہ دوست کا اعتبار کرنا ہے کیونکہ دوستی اعتبار سے عبارت ہوا کرتی ہے جب اعتبار معدوم ہو جاتا ہے تو پھر دوستی گریزپا ہو جاتی ہے ہجر عاشق کی سیہ بختی سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی پر وحشت کیفیات میں بھی اپنے محبوب کا انتظار کرنا چاہیے شعرِ دوم میں وہ کہتی ہیں کہ جیون کٹھنائیوں اور اولجھنوں سے عبارت ہے لیکن ان مشکلوں میں پریشان و مضطرب نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہنس ہنس کر رومان پروری کرنی چاہیے اس شعر میں ایک عزمِ صمیم کا اظہار بھی ہے اور زندگی کا وقار بھی ہے شعرِ سوم میں انتظارِ جاناں کی عکاسی ہے اور شام کو خوشگوار کرنے کا ولولہ بھی ہے انتظارِ آمد کے ساتھ شام خوشگوار کا اظہار بہت ہی دلفریب تصور ہے شعرِ چہارم میں جہاں شومئی قسمت کا تذکرہ ہے وہاں بہار کی نوید سعید بھی ہے اور شعر میں صنعتِ تضاد کا فطری التزام ہے شعرِ پنجم میں مایوسیوں کے گھیراؤ کا منظر بھی ہے اور انہیں شمار کرنے

کا ارادہ بھی ہے شعرِ آخر کے مصرعِ اول میں اعتراف محبت کا بیان ذیشان بھی ہے اور ایک وشواس بھی ہے کہ کیا خبر کب اُس نے مجھے پیار کرنا ہے مجموعی طور پر پورری غزل رومانیت سے لبریز ہے۔

اب اُن کی دوسری غزل کی طرف بڑھتے ہیں جو دامن التفات کھینچ رہی ہے۔

آواز دے کے مجھ کو بلایا تھا کس لیے؟
ہاتھوں میں لے کے ہاتھ دبایا تھا کس لیے؟
ترکِ تعلقات ہی مقصود تھے اگر!
اے دوست دل کو دل سے لگایا تھا کس لیے؟
رستے میں چھوڑ کر مجھے جانا تھا گر تجھے!
راہِ وفا پہ گام بڑھایا تھا کس لیے؟
اب منع کر رہے ہو صنم پوجنے سے تم
پتھر کا تم نے خود کو بنایا تھا کس لیے؟

آپ نے دیکھا ان کی یہ غزل سراپا رومانیت ہے انتہائی سادگی سے معاملاتِ عشق و الفت کا سلاست کے پیرائے میں اظہار کیا جا رہا ہے ان کے قاری کو لغت ملاحظہ کرنے کا تکلف نہیں کرنا پڑتا عام آدمی بھی ان کے جذبات و احساسات و محسوسات سے آسانی سے آشنا ہو سکتا ہے پہلے شعر میں یہ فرمایا گیا ہے محبوب سے تخاطب ہے کہ آپ نے مجھے آواز دے کر کس لیے بلایا تھا اور پھر اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ کو کس لیے دبایا تھا اگر آپ نے مجھ سے پیار نہیں کرنا تھا تو سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی ہاتھوں میں ہاتھ کو دبانا یہ بھی راہِ الفت کی ایک عمومی ادا ہے دوسرے شعر میں ترکِ تعلقات کی بات کی گئی ہے محبوب سے واشگاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ آپ کا مقصد اگر ترکِ تعلقات پر منتج تھا تو پھر آپ نے اپنے دل کو میرے دل سے کس لیے لگایا تھا اس غزل میں ردیف ''کس لیے'' ایک دلچسپ ندرت پیدا کر رہی ہے جو ان کی جودتِ طبع کی غماز ہے تمام غزل میں ایک استفسار کا انداز پایا جاتا ہے تیسرے شعر میں محبوب دلنواز سے یہ پوچھ گچھ کی جا رہی

ہے کہ اگر آپ نے مجھے بیچ منجدھار کے چھوڑ کے جانا ہی تھا تو الفت کی اس ڈگر پر قدم کیوں رکھا چوتھے شعر میں یہ عکاسی موجود ہے کہ محبوب ظریف بات بات پر بگڑ جاتا ہے اور اس سے پوچھا جا رہا ہے کہ اگر آپ نے یہ رویہ اختیار کرنا تھا تو آرزو ئے الفت کو کیوں پروان چڑھایا تھا آخری شعر میں ندرتِ خیال اور خیال آفرینی ملاحظہ کیجیے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اے میرے محبوب دلنشیں آپ نے اپنے آپ کو پتھر کے صنم کی طرح سخت کر لیا ہے اور میں آپ کو پوجنا چاہتی ہوں اور آپ کس لئے منع فرما رہے ہیں اس قسم کے خیالات کلاسیکی اور روایتی شاعری میں تو بہت مل جاتے ہیں لیکن عصرِ حاضر میں شاذ ہی نظر آتے ہیں۔

ایک اور ان کی غزل دیکھتے ہیں۔

کچھ نہ جب بن پائے سب کو چھوڑ کے
میرے پاس آجائے سب کو چھوڑ کے

کاش ایسا ہو کہ لے کر میرا نام
اپنا دل بہلائے سب کو چھوڑ کے

پوچھتی ہوں اس کو اور ہے آرزو
وہ میرا ہو جائے سب کو چھوڑ کے

اس کو جاناں یاد آئے گی ضرور
جب بھی وہ گھبرائے سب کو چھوڑ کے

جاناں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی غزل رومانس سے شروع ہوتی ہے اور رومانس پر ختم ہوتی ہے وہ اس لطیف صنف کو دیگر الائشوں سے مبرا و ماورا رکھتی ہیں جیسے انہوں نے اپنے آپ کو اس موضوع کے لیے وقف کر رکھا ہو اصل میں کائنات کا سرنامہ موضوع پریم ہی ہے باقی موضوعات اس موضوع کے امدادی موضوعات ہیں شعرِ اول میں مذکور ہے محبوب کی نسبت سے کہ جب کچھ نہ بن پڑے سب کو چھوڑنے کے بعد بھی تو میرے پاس چلے آنا دوسرے شعر میں ایک ایسی

آرزو کا اظہار ہے جو ہر عاشق کے دل میں لگن کی طرح ہوتی ہے کہ میرا محبوب میرا نام لے کر اپنا دل بہلائے اور باقی سب کو چھوڑ دے تیسرے شعر میں ایک معصوم خواہش کا برملا ذکر ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ میں اپنے محبوب کو اس لیے پوجتی ہوں کہ وہ سب کو چھوڑ کر میرا ہو جائے چوتھے شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے دلربا کو میری یاد ضرور آئے گی کیونکہ جب وہ سب کچھ تج دینے کے بعد گھبرائے گا تو اُسے ضرور میرا پیار یاد آ جائے گا اس قسم کا احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی کو اپنی وفا پر مان ہوتا ہے اس غزل میں "سب کو چھوڑ کے" کی ردیف ندرت آمیز ہے اور بہار آفریں بھی ہے غزل کے لطف کو دوبالا کر رہی ہے۔

اب ایک اور غزل کے تین اشعار پڑھتے ہیں ۔

زندگی کے ہر ایک پہلو میں
تیری چاہت کے پھول کھلتے ہیں
دل سے کم ہو کبھی نہ پیار تیرا
دل میں ارماں یہی تو پلتے ہیں
جس طرف تم نظر کرو اپنی
لوگ اس سمت کو ہی چلتے ہیں

زندگی کے کئی پہلو ہوتے ہیں جس کی زندگی کا ہر روپ عکاس الفت ہوتا ہے تو وہ چاہے جانے اور سراہے جانے کے قابل ہوتا ہے اسی طرح کی کیفیت جاناں کی غزل کے پہلے شعر میں پائی جاتی ہے اور اس میں یہ آدرش دیا جا رہا ہے کہ میری زندگی کے ہر پہلو میں محبت کی پاسداری اور علمداری ہے زیست کا ہر گوشہ جاناں کے پیار کا حوالہ ہے اور جگہ جگہ چاہت کے پھول کھل رہے ہیں دوسرے شعر میں ایک دعائیہ انداز ہے کہ کبھی بھی میرے دل میں آپ کا پیار کم نہ ہو اور یہی ارمان ہی دل میں پنپ رہا ہے کہ آپ کا پیار فزوں سے فزوں تر ہوتا چلا جائے تیسرے شعر میں محبوب کی ہر دلعزیزی کا بیان ذیشان ہے اور محبوب کو اس چیز کا احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم جس

طرف نظر کرو لوگ اس طرف چلنا شروع کر دیتے ہیں یعنی تم زمانہ ساز ہو زمانے کا رخ پھیر دیتے ہو اس جذبے کا مقصد محبوب کو اس کی اپنی اہمیت باور کرانا ہے۔

اب ان کی ایک چہار شعری غزل ملاحظہ کرتے ہیں۔

زیست آسان ہوگئی ہے اب
تجھ سے پہچان ہوگئی ہے اب

اب ہے دونوں کے پاس موبائل
زیست آسان ہوگئی ہے اب

چھین لوں کیسے تجھ سے یاد اپنی؟
میرا ایمان ہوگئی ہے اب

حال کیا پوچھتے ہو جاناں کا؟
وہ تری جان ہوگئی ہے اب

وہی سادگی جو جاناں کا خاصا ہے اس غزل سے بھی عبارت ہے پہلے شعر میں محبوب سے مخاطب ہے کہ اے میرے محبوب جب سے تجھ سے پہچان ہوئی ہے تو میری زندگی آسان ہوگئی ہے گویا تجھ سے شناسائی کی بدولت زیست مہربان ہوگئی ہے دوسرے شعر میں تذکرہ ہے رابطوں کا کہ اے میرے محبوب تمہارے پاس بھی موبائل ہے اور میرے پاس بھی موبائل اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے دل کے احوال ارسال کرتے رہیں گے فون کالز کے ذریعے اور پیغامات کے ذریعے لہٰذا اب پریشانی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ تیسرے شعر میں کہا جا رہا ہے کہ اے میرے محبوب میں تجھ سے اپنی یاد کیسے چھین لوں کیونکہ تمہارے دل میں میری یاد ایمان ہوگئی ہے یادیں جب ایمان بنتی ہیں پھر محبت کی معراج ہوتی ہے چوتھا شعر جو غزل کا آخری شعر ہے جس میں جاناں یہ کہہ رہی ہیں جاناں تم میرا حال کیا پوچھتے ہو میں تمہاری جان ہوگئی ہوں شعرِ ھٰذا محبت کی اس اسٹیج کا تذکرہ ہے جب محبت میں یک جان یک قالب کی کیفیت پیدا ہوتی

ہےاور من وتو میں فرق ناپیدو معدوم ہو جاتا ہے۔

اب ہم جاناں کی دوسری کتاب ''خواب زندہ'' ہیں۔کی بابت بات چلاتے ہیں جاناں کے شعری ارتقا کا سفر جب ''بزم جاناں'' سے ''خواب زندہ ہیں'' پر پہنچتا ہے تو ان کے اسلوب میں مزید جاذبیت اور چاشنی پیدا ہو جاتی ہے اسلوبیاتی ندرت جہاں شوکتِ الفاظ بھی ہے وہاں طاقتِ پرواز بھی ہے جاناں کے تخیل کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے استعارں اور تشبیہات کا ایک نیا جہان آباد ہے ''بزم جاناں'' سے ''خواب زندہ ہیں'' کی جاناں منفرد و نمایاں نظر آتی ہے۔

ذاتی حوالے کی حامل ایک غزل زیر تجزیہ لاتے ہیں۔

کسی منظر میں ڈھلنا چاہتی ہوں
شفق کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں
بریدہ ہیں مرے پر تو ازل سے
ہواؤں میں بھی اڑنا چاہتی ہوں
کہاں ہیں جھیل کے رنگین منظر؟
انہیں کے ساتھ سجنا چاہتی ہوں
سجے تھے آئینہ میں عکس جن کے
میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں
مگر جاناں بھی اب آئے نہ آئے
میں خوابوں کو ہی بُنا چاہتی ہوں

یہ غزل اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ ''بزم جاناں'' اور ''خواب زندہ ہیں'' کے اسلوب اور فکری زاویوں میں بھی فرق ہے یہ غزل تمام تر ذاتی خواہشات کا حوالہ ہے پہلے شعر میں اس آرزو کی بات ہے کہ میں کسی منظر میں ڈھلنا چاہتی ہوں اور شفق کے ساتھ بھی چلنا چاہتی ہوں دوسرے مصرع میں ایک عالمگیریت کی خواہش موجزن ہے کہ وہ شفق کے ساتھ چلنا چاہتی ہیں کیونکہ شفق تو

تمام کائنات پر محیط ہے دوسرے شعر میں ایک اظہارِ مجبوری ہے کہ میرے پر تو کٹے ہوئے ہیں ازل سے اور ہواؤں سے مخاطب ہیں کہ تمہارے ساتھ اڑنا چاہتی ہوں تیسرے شعر میں احساسِ جمال کا پر تو بھی ہے جو ان کے جمالیاتی احساسات کا مظہر ہے وہ کہتی ہیں کہاں ہیں جھیل کے رنگین منظر میں ان کے ساتھ سجنا چاہتی ہوں جمالیات اور روحانیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور انہوں نے اس کا ساتھ بخوبی نبھایا ہے چوتھا شعر بھی ذوق جمال پر دال ہے وہ کہتی ہیں جو عکس آئینہ میں تھے میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مقطع میں ایک شان بے نیازی کی ادا ہے وہ سحر کے آنے نہ آنے سے بے نیاز ہیں جہاں کی تیرگی انہیں آلودہ نہیں کر سکتی اور وہ صرف خوابوں کو بننا چاہتی ہیں۔

رومانوی افکار کی حامل ایک اور غزل پڑھتے ہیں۔

میرے دل پر وہ اب چھانے لگا ہے
مجھے دن رات تڑپانے لگا ہے
میرے دل کو ہتھیلی پر سجا کر
جہاں کو سحر سکھلانے لگا ہے
میں اب سسّی ہی بنتی جا رہی ہوں
کوئی پنّوں نظر آنے لگا ہے
مرا تو ذہن بھی چلتا نہیں اب
مجھے ہر بات سمجھانے لگا ہے
یقین بن کر سجا ہے دل میں میرے
سمجھ کر وہ گماں جانے لگا ہے

پانچ شعروں کی اس غزل میں جاناں نے گلشنِ رومان میں طرح طرح کے گل کھلائے ہیں جن کی بوباس منفرد ہے شعر اول میں محبت کی طاقت اور سحر انگیزی کا بھرپور اظہار ہے کیا گیا ہے کہ وہ محبوب جاں نواز میرے دل پر چھانے لگا ہے اور میرے دل پر غلبہ حاصل کر رہا ہے اور دن رات

اسکی یاد مجھے تڑپانے لگی ہے حسن ایمائیت کے حامل غزل کے دوسرے شعر میں مذکور ہے کہ میرا محبوب میرے دل کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر ابنائے زمانہ کو اپنی جادوگری کا درشن کرا رہا ہے اگلا شعر احساسِ خود محبوبی کی عمدہ نظیر ہے جس میں جاناں کہتی ہیں کہ میں سسی بنتی جا رہی ہوں یعنی میں کسی کی محبوب نظر بن رہی ہوں مجھے اب کوئی پُنوں نظر آنے لگا ہے ایک کلاسیکی رومانوی داستان کا حوالہ ہے اس میں اور جاناں کی خواہش کا اظہار بھی ہے چوتھے شعر میں ایک عالمگیر حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ محبت میں انسان کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور وہ ہن کام کرنا چھوڑ جاتا ہے۔ یہی کیفیت اب ان کی بن گئی ہے اور انہیں محبوب ہی سب کچھ سمجھانے لگا ہے آخری شعر میں صنعت تضاد کا بے ساختہ انصرام ہے پہلے مصرع میں یقین کی بات کی گئی ہے تو دوسرے مصرعے میں گمان کی وہ کہتی ہیں کہ میرا محبوب یقین بن کر میرے دل میں چھایا ہوا ہے اور اب وہ گماں بن کر جانے لگا ہے خیالات میں سادگی اور تسلسل ہی ان کی خوبی ہے جو ان کی تمام تر غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔

اب دیکھئے ایک اور غزل کے دو اشعار کی رومان سامانیوں کو اور حظ اٹھائیے۔

موسم ہجر آزماتا ہے
وصل کا چاند یاد آتا ہے
دیکھ کر پھول میرے جوڑے میں
کوئی بھنورا ہے مسکراتا ہے

وہی روانی ہے وہی تسلسل ہے جو ان کی غزل کی جان بنا ہوا ہے اور وہی رومان آفرینی ہے جو ان کی غزل کی امتیازی علامت ہے پہلے شعر میں وہ کہتی ہیں کہ ہجر کا موسم مجھے آزماتا ہے کیونکہ عشاق کے لیے ہجر ایک بہت بڑی آزمائش و ابتلا ہے وصل کی یادیں ہجر میں قیامت بن جایا کرتی ہیں یہی کیفیت اس شعر میں بیان کی گئی ہے دوسرے شعر میں یہ کہہ رہی ہیں میرے جوڑے میں پھول دیکھ کر کوئی بھنورا ہے مسکراتا ہے بھنورا چونکہ عاشق کا استعارہ ہے اس لئے اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ان کی ایک اور غزل ملاحظہ کرتے ہیں ۔

کچھ بھی چاہت کے سوا یاد نہیں
میرے لب پہ کوئی فریاد نہیں

دل کی بستی جو تھی ویران بہت
اب کہوں کیسے کہ آباد نہیں؟

ہیں گرفتار محبت سارے
اس نگر میں کوئی آزاد نہیں

خواب زندہ ہیں ابھی دل میں میرے
اس قفس کا کوئی صیاد نہیں

پیار تم کرتے رہو جاناں سے
کوئی اس جیسا بھی برباد نہیں

پہلا ہی شعر غماز محبت ہے جسم و جاں عقل و شعور جب محبت کے اسیر ہوتے ہیں تو انسان کو کچھ یاد نہیں رہتا اور نہ لب پر کوئی فریاد رہتی ہے بلکہ انسان شاکر و قانع ہو جاتا ہے انہی خیالات کا اظہار پہلے شعر میں کیا گیا ہے کہ مجھے چاہت کے سوا کچھ یاد نہیں ہے اور میرے لبوں پر کوئی فریاد نہیں ہے دوسرے شعر میں وہ کہتی ہیں کہ میرے دل کی بستی جو بہت ویران تھی اب میں کیسے کہوں کہ وہ آباد نہیں ہے تیسرے شعر میں ایک گنگا جمنی کیفیت پائی جاتی ہے دونوں مصرعے ایک ہی فکر کی عکاسی کر رہے ہیں کہ دنیا میں سب محبت زدہ ہیں اور اس نگر میں کوئی بھی آزاد نہیں ہے کسی کو بھی محبت سے مفر ممکن نہیں ہے اس شعر میں ایک فطری حقیقت کی ترجمانی بھی موجود ہے جو اس شعر کے لطف کو سہ بالا کر رہی ہے چوتھے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ ابھی تک میرے دل میں میرے خواب زندہ ہیں اور اس قفس کا کوئی صیاد نہیں ہے دل کو قفس سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایک حسنِ ایمائیت پیدا کیا گیا ہے جو ان کی فنی پختگی کی کرشمہ کاری ہے اور فنی بلوغت کی ایک مثال باکمال ہے مقطع میں

ایک رحم کی اپیل کا سا انداز ہے کہ تم جاناں سے پیار کرتے رہو دنیا میں اس جیسا کوئی شخص برا نہیں ہے مذکورہ بالا غزل بھی ایک سادگی و پرکاری کا شاہکار ہے۔

اب ان کی ایک اور غزل دیکھتے ہیں۔

دل لگ گیا جو کسی کے حسن و جمال سے
تھے اور ہی طرح کے نئے خدوخال سے

دیوانگی مری تو مجھے ماردے گی پر
کیسے نکل سکیں گے ستم گر کے جال سے؟

کیوں دسترس میں آکے بھی میرا نہیں ہوا
کچھ بھی عیاں نہیں ہے صنم تیری چال سے

ہوتا ہے ہم کلام وہ شام و سحر مگر
آنکھوں میں لگ رہے تھے نئے کچھ سوال سے

جاناںؔ تو اس کی یاد میں کیسے سما گئی؟
پوچھیں گے ایک دن اسی باکمال سے

غزل چونکہ ایک صنفِ لطیف ہے کیونکہ لطیف خیالات و احساسات کی حامل ہوتی ہے غزل ہذا بھی لطیف احساسات سے مرصع ہے جاناں غزل کی تمام تر باریک بینیوں سے آشنا ہیں شعرِ اول میں یہ کہا گیا ہے کہ میرا دل لگ گیا ہے کسی کے حسن و جمال سے اور میں کسی کی شیدا و شیفتہ ہوگئی ہوں اور محبوب کے خدوخال کی جدت کا بھی مذکور ہے شعرِ دوم میں ایک ایسے اندیشے اور جوکھم کی نشاندہی ہے کہ میری دیوانگی مجھے مار ڈالے گی اور میں کیسے ستمگر کے جال سے مفر حاصل کر پاؤں گی شعرِ ثالث میں ایک استفہامیہ انداز ہے کہ میرا محبوب میری دسترس میں آکے بھی میرا کیوں نہیں ہوسکا اور اس کی چال میں ایک طرفگی ہے جس کی کچھ سمجھ نہیں آتی شعرِ چہارم میں محبوب سے شام و سحر کے مکالے کی بات ہے کہ وہ شام و سحر مجھ سے باتیں کرتا ہے اور اس کی آنکھوں میں مجھے کچھ نئے سوال دکھائی دیتے ہیں شعرِ آخر میں بھی ایک استفسار ہے کہ اے جاناںؔ تو اس کی ذات میں

کیسے سا گئی اور ہم پیرا زایک دن اپنے محبوب کی بدولت افشا کریں گے غزل میں ندرتِ خیال بھی ہے اور اظہار کمال بھی ان دو خصوصیات نے اس غزل کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

اب ایک اور غزل کا مقطع و مطلع ملاحظہ فرمائیں

کسی کے دل میں بسنا چاہتی ہوں
سبو سے جام بھرنا چاہتی ہوں
تری خوشبو بدن میں گھومتی ہے
میں جاناں ساتھ چلنا چاہتی ہوں

مطلع میں کسی کے دل میں بسنے کی آرزو اور سبو سے جام بھرنے کی خواہش یہ دونوں تلازمے کسب عاشقی ہیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے دل میں تھوڑی سی جگہ چاہتی ہیں جیسے سبو سے جام بھرنے سے سبو پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا وہ کہتی ہیں آپ اگر مجھے اپنے دل میں بسنے دیں تو یہی میری تمنا ہے یہی میرا تقاضا ہے

ایک اور غزل کے چار اشعار دیکھیں

بہت مجبور ہوتی جا رہی ہوں
میں تم سے دور ہوتی جا رہی ہوں
ازل سے کر رہی ہوں تیرا پیچھا
تھکن سے چور ہوتی جا رہی ہوں
ہو تم اگر روشنی کوئی بالہ
تو میں پر نور ہوتی جا رہی ہوں
تمہاری یاد پھر سے آ رہی ہے
تبھی مخمور ہوتی جا رہی ہوں

تسلسل جاناں کی غزل کا ایک وصفِ خاص ہے مندرجہ بالا غزل میں بھی یہی خصوصیت ہے

پہلے شعر میں وہ اپنے محبوب سے کہتی ہیں کہ میں بہت مجبور ہوتی جا رہی ہوں اور اس کا سبب یہ ہے کہ تم سے دور ہوتی جا رہی ہوں دوسرا شعر راہ محبت میں مسلسل کاوشوں کا عکاس ہے وہ اپنے محبوب دل نواز سے کہتی ہیں کہ میں ازل سے آپ کا پیچھا کر رہی ہوں کیونکہ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں اور اس کاوش میں تھکن سے چور ہوتی جا رہی ہوں محبوب کی تلاش میں تھکن سے چور ہونا بھی عشاق کے لیے کار ثواب سے کم نہیں جس کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے تیسرے شعر میں یہ فرمایا کہ اگر تم روشنی کا ہالہ ہو تو میں بھی تمہارے توسط اور تمہاری برکت سے پر نور ہوتی جا رہی ہوں چوتھے شعر میں کہا گیا ہے کہ مجھے تمہاری یاد آ رہی ہے پھر سے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مخمور ہوتی جا رہی ہوں۔

مندرجہ بالا معروضات اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ جاناں نے اپنے سخن میں رومان پروری کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی یہی وجہ ہے کہ رومان ان کی شاعری کا مستقل حوالہ ہے ان کی رواں دواں اور رومانیت سے لبریز غزلیں دل زدوں کے لیے مسیحائی کا ساماں رکھتی ہیں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر تواتر سے ان کی شعری ریاضت جاری رہی تو وہ جلد شعر و سخن کی دنیا میں ممتاز و منفرد مقام پا لیں گی۔

☆☆☆☆☆

فرزانہ جاناںؔ (اسلام آباد)

اب اس کا کوئی خط بھی جلانا تو نہیں تھا
وحشت کا کوئی گھر بھی بنانا تو نہیں تھا

جلتا تھا جو چراغ محبت میرے دل میں
اس روشن کی لو کو بجھانا تو نہیں تھا

اب شام سے ہی دل کا یہ در کھلنے لگا ہے
یادوں کا دشت میں بھی ٹھکانا تو نہیں تھا

اب تو وصالِ یار کی خواہش بھی نہیں تھی
موسم بھی شہرِ آس میں سہانا تو نہیں تھا

دریا کو پار کرنا وہ بھی کچے گھڑے پر
اب چاک پر گھڑے کو گھمانا تو نہیں تھا

فرزانہ جاناں (اسلام آباد)

تیری آنکھیں کمال کرتی ہیں
جانے کیا کیا سوال کرتی ہیں؟

میرے دل میں جو تیرے باعث تھیں
دھڑکنیں اب ملال کرتی ہیں

ذات کے میں حصار سے نکلوں
خواہشیں اب دھمال کرتی ہیں

خوب ہیں یہ پیار کی گھڑیاں
زرد رت کو گلال کرتی ہیں

پتلیاں گھومتی ہیں آنکھوں میں
رقص مثلِ غزال کرتی ہیں

اس کی یادیں عجیب ہیں جاناں
مجھ کو غم سے نڈھال کرتی ہیں

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام

کشور ناہید کے شعری رجحانات

شاعری لاتعداد رجحانات و میلانات سے عبارت ہے کسی بھی معتبر شاعر کے ہاں اس کے بے شمار فکری زاویے مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں جس سخن داں کے مشاہدات و تجربات عمیق ہوں گے اس کے افکار بھی اس قدر وسیع و بسیط ہوں گے عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر شعراء و شاعرات کے رجحانات عمومی موضوعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں نسائی شعری ادب میں معدودے چند شاعرات ایسی ہیں جن کے ہاں فکری رجحانات کی بہتات ہے انہی معتبر ہستیوں میں ایک نام کشور ناہید کا بھی ہے جن کا کلام فکری وفنی پختگی کا غماز ہے زبان و بیان کا معیار اعلیٰ و ارفع ہے موضوعات میں وسعت اور تنوع ہے ان کا تعلق دبستانِ لاہور سے ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے شعری مجموعہ، ''لب گویا'' مطبوعہ 1991ء کے شمس اول کے منتخب غزلیہ اشعار کے رجحانات کو زیر بحث لاتے ہیں۔

خلوص و مروت کے فقدان کا مسئلہ ہر عہد میں درپیش رہا ہے اور ہر دور کے شعری ادب میں بھرپور انداز میں بیان ہوا ہے شومئی قسمت سے یہ المیہ گھمبیر اور ہمہ گیر ہے تاریخ کے ہر حصے میں اسکی بازگشت سنائی دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری سماجی اور اخلاقی اقدار میکانزم کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں جن پر مادی دور کا انسان قابو پانے سے قاصر ہے اسی حوالے سے ان کے ہاں نالہ وشیون کے خطیر و پہلو ملتے ہیں کبھی عمومی تجربے کی صورت میں تو کبھی مشیت سے شکوہ و شکایت کے انداز میں ہیں اس لیے ان کی شاعری حرفِ شکایت کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے یہی سبب ہے کہ ان

کے ہاں تنقیدی رویے وفور سے ملتے ہیں ان کی غزل کے دو اشعار اسی پس منظر میں لائق توجہ ہیں۔

نہ کوئی ربط بجز خامشی و نفرت کے
ملیں گے اب تو خلا سے ہی محبت کے
زمامِ کار جہاں کس کے ہاتھ ہے یا رب؟
بدل گئے ہیں تقاضے بھی آدمیت کے

ان کا طرزِ اظہار غیر معمولی اور غیر روایتی نوعیت کا ہے اور نظیر تر کیبات و تشبیہات کا ایک جہاں آباد ہے ان کی تمثیلات قرینہ کاری کا مظہر ہیں افکار رفعتوں کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں فکری وفنی اور لسانی بالیدگی کے مظاہر آغوش کشا نظر آتے ہیں ان کے داخلی احساسات خارجی اظہار کی راہیں ہموار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اموز گاری کے شواہد کا انبار ہے جو جا بجا کارگر دکھائی دیتے ہیں کہیں کہیں بین السطور حیرت واستعجاب کی کیفیات جلوہ ریز ہو رہی ہیں ان کی ایک غزل کے چند اشعار دیدنی ہیں۔

آنکھوں کے آئینوں کا تو پانی اتر گیا
اب جسم چوب خشک ہے یہ سانحہ بھی دیکھ
ہوتی ہے زندگی کی حرارت رگوں میں سرد
سوکھے ہوئے بدن پہ چڑا کسا بھی دیکھ
بے تابیوں کو سینے کے اندر سمیٹ لے
فتنے کو اپنی حد سے مسلسل بڑھا بھی دیکھ
ہر ذرہ عبرتوں کے سمندر کی شکل ہے
صحرا نورد شوق کبھی نقش پا بھی دیکھ

اُن کے تخیلات میں داخلی اظہار کے وسیع تر شواہد ملتے ہیں اور وہ داخلیت میں ید طولیٰ رکھتی ہیں ان کی شعری تمثیلات انتہا درجے کی خوبصورت اور حد کمال کو چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں

عصری رویّوں کی عکاسی بھی ان کے ہاں قابلِ دید ہے ان کی ایک غزل کے دو اشعار زیبِ قرطاس ہیں۔

آنکھوں میں سوئی خواہشیں جاگیں تو جسم بھی
ساکت سمندروں پہ کھلا بادباں لگا

وہ شخص جس کی آنکھ بے رنگ بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا

کشورناہید کے شعری ادراکات عمیق و بسیط ہیں جن میں عرفانی شعور جھانکتا ہوا نظر آتا ہے وہ حقیقی زندگی کی حقیقتوں کی شناور ہیں ان کے کلام سے قاری کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے تخیل کی اڑان بہت بلند ہے ان کی ایک غزل کا ایک شعر قابلِ غور ہے۔

کرزو نہ پانیوں میں پڑے عکس کی طرح
پیچھے ہٹو نہ سطوتِ آزار دیکھ کر

مذکورہ استشہادات مشتے از خروارے کے مصداق ہیں ان کا تمام تر کلام سراپا انتخاب ہے ان کے ہاں بے پناہ شعری رجحانات ہیں ان گنت موضوعات ہیں خوبصورت استعارات و ترکیبات و تشبیہات ہیں مزید شعری ریاضت ان کے لیے فزوں تر معیارات کی ضامن بن سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کشور ناہید (لاہور)

ایک ہی آواز پر واپس پلٹ آئیں گے لوگ
تجھ کو پھر اپنے گھروں میں ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

ڈوبتے سورج کی صورت میرا چہرہ دیکھ لو
پھر کہاں بابِ معانی ڈھونڈنے جائیں گے لوگ؟

مت کہو قسمت ہے اپنی بے دلی ، ناگفتنی
پھر سحر ہوگی درخشاں پھر بھلے آئیں گے لوگ

پل جھپکنے تک ہے یہ ہنگامۂ وارفتگی
جب نظر سے دور ہوگے بھولتے جائیں گے لوگ

پھر نئی خواہش کے ذروں سے بنائیں گے نگر
پھر نئی رسمِ طلب رسمِ وفا لائیں گے لوگ

منحصر رنگوں کی آتش پر نہیں ہے دلکشی
میلے کپڑوں میں بھی تجھ کو دیکھنے آئیں گے لوگ

کشور ناہید (لاہور)

شاعروں کے جو پاس رہتے ہیں
وہی اکثر اُداس رہتے ہیں

غم بہر طور اور بہر عالم
زندگی کا لباس رہتے ہیں

داغ دل کے کبھی محبت میں
بن کے بیٹے میں آس رہتے ہیں

دل کی دھڑکن بھی اب نہیں میری
آپ کیوں اتنے پاس رہتے ہیں؟

دل بہت ڈھونڈتا ہے تنہائی
ہم بہت اُن کے پاس رہتے ہیں

گل زیب زیبا کا کلام اور عصری آشوب

تخلیق کار یا سخنور کا کام حالات و واقعات کو حقیقی انداز میں بیان کرنا اور زیست کے مصائب و آلام کا مداوا تلاش کرنا ہے عموماً چونکہ حالات نا مساعد رہتے ہیں اس لیے عہد کی آشوب زدگیوں کا مذکور عصری آشوب کہلاتا ہے۔ جن سخن گستروں کا کلام ان کیفیات و واردات سے عبارت ہوتا ہے ان کے ہاں عکسِ دوراں واضح طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اسی لیے اُن کے سخن کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ شذرہ ھٰذا میں ہم گل زیب زیبا کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کی شاعری مذکورہ خصوصیات سے متصف ہے اُن کے شعری مجموعہ مطبوعہ 1998ء ''گل ریگزار'' کے نصف اول کی منتخب غزلیات شامل تجزیہ کرتے ہیں گل زیب زیبا کا تعلق دبستان کراچی سے اور ان کے شوہر نثار احمد نظامانی ضلع سانگھڑ کے ایک زمیندار ہیں زیبا جی کے ہاں ذوق و شوق پوری فراوانی سے موجود ہے کتاب ھٰذا کے پیش لفظ '' میں اور میری شاعری '' میں لکھتی ہیں۔ '' پروفیسر آفاق صدیقی کو بھی اہلیا نے گھر اٹھا لائی اور اس مجموعے پر جبری اصلاح کی پھر محسن بھوپالی کو زحمت دی اور اُن سے کلام کے انتخاب میں مشورہ لیا۔''

انسانی طبائع میں وہ انقلاب آیا کہ خلوص و مروت نے اپنی بساط لپیٹ لی جس کے لازمی نتیجے کے طور پر غرور و تکبر نے فروغ پایا اور پندارِ خدائی کے باعث ہر شخص کی گردن اکڑ رہ گئی ایک لایعنی انا کا بول بالا ہوا ہے جب انسانی رویے نا ہموار ہوں کج روی عروج پر ہو تو ایک حساس دل انسان محوِ فریاد اور مصروفِ فغاں ہو جاتا ہے جس کے نا خوشگوار اثرات ماحول پر بھی مرتب ہوتے

ہیں تو پھر ہوائیں روٹھ جاتی ہیں حبس زدہ موسم میں حیاتِ انسانی کی سانسیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں پھر زیست ایک عقوبت ناک منظر پیش کرتی ہے حقیقی انا کا خون ہو جاتا ہے ہر سو ظلمت و وحشت ایک مہیب منظر پیش کرتی ہے جب ہر ہاتھ میں خنجر اور ہر آستیں پر خون ہو تو پھر سماج قاتل و ستمگر کا روپ دھار لیتا ہے سنسار روزِ حشر سماں بن جاتا ہے جیسا کہ آج کل کراچی کے حالات ہیں اسی طرزِ فکر کے حامل ان کی غزل کے چار اشعار دید نی ہیں۔

بکھری ہوئی ہے تیری انا تیرے شہر میں
ہر شخص بن گیا ہے خدا تیرے شہر میں
دیتی رہی ہوں روز صدا تیرے شہر میں
کترا رہی ہے مجھ سے ہوا تیرے شہر میں
جینا بھی ہو گیا ہے سزا تیرے شہر میں
خنجر ہر ایک ہاتھ میں ہر آستیں پہ خوں
زیبا کو کس نے قتل کیا تیرے شہر میں؟

حالات کے بگڑنے اور مسائل کے الجھنے کے اسباب جب بے چگونی کیفیت اختیار کر جاتے ہیں تو پھر گومگو کا وہ عالم ہوتا ہے کہ انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جان پاتا اور اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا ایک حساس انسان تا حیات وفاؤں کی پالنا کرتا رہتا ہے اور مروتوں کا خوگر رہتا ہے اس سعیِ جمیل میں اپنا سب کچھ وار دیتا ہے قدرتِ ایزدی انسان کو زندگی کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور وہ حیات کی کٹھنائیوں کے آگے سینہ سپر ہو جاتا ہے گل زیب زیبا کے ہاں فنی چابکدستی کا یہ عالم ہے کہ وہ مشکل ردیفوں، قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں زبردست مضمون آفرینی کے جوہر دکھلاتی ہیں اور ان کے تخیل کی جولانی اور روانی پوری آب و تاب سے کارفرما ہے اسی تناظر میں اُن کی غزل کے چار اشعار دیکھیں۔

کس نے کیا ہے خونِ جگر کچھ نہ پوچھیے؟

ہم خود بھی جانتے ہیں مگر کچھ نہ پوچھیے

راہِ وفا میں ایسے بھی کچھ مرحلے رہے

ہم نے جلایا اپنا ہی گھر کچھ نہ پوچھیے

وہ کون سی طلب تھی کہ ہم تنہا ہو رہے؟

دنیا کے آگے سینہ سپر کچھ نہ پوچھیے

عہدِ وفا کا ہم نے بھرم اس طرح رکھا

خود کو کیا ہے خاک بسر کچھ نہ پوچھیے

محبت کا فقدان انسان کو وحشت کی ہولناکیوں سے ہم آغوش کر دیتا ہے عالمِ ہجراں میں دامن چاک اور گریباں تار تار ہو جاتا ہے پھر کوئی رفوگر میسر نہیں آتا یہ صورتِ حال اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ دلِ دریدہ کو الفت نہیں ملی اسی حوالے سے اُن کا ایک قطعہ لائقِ توجہ ہے۔

آنکھوں کو اشک چہرے کو وحشت نہیں ملی

شاید تمھیں کسی کی محبت نہیں ملی

دامن ہی چاک ہے نہ گریبان تار تار

کیا یارِ دل نواز کی صحبت نہیں ملی؟

جب دردوں کی دنیا میں حزن والم کے لاوے اُبلتے ہیں تو پھر کتھارس کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور داخلی اظہار کو فروغ ملتا ہے اگر زبان اظہار سے قاصر رہے تو داخلی دنیا غم و یاس کی اماجگاہ بن جاتی ہے اس لیے کتھارس کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے اسی نسبت سے اُن کی غزل کا یہ شعر لائقِ التفات ہے۔

وہ دل کا مرے ناسور بنی

جو بات زباں نہ کہہ پائی

حالات کی واژگونی اس قدر پر ہول صورت اختیار کر گئی ہے کہ انسان کو کہیں بھی جائے اماں

میسر نہیں ہے جب دہشتوں کا دور دورہ ہو تو جان بچانا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اس عصری آشوب کی غمازی اُن کی غزل کے اس شعر میں قابلِ غور ہے۔

یہ بہت ہے کہ شر کے میلے میں
جان اپنی بچا کے گھر لاؤں

مشمولہ استشہادات اس امر کی شاہد دل ہیں کہ گل زیب زیبا کے فکری کینوس میں عصری حالات کی واژگونی کا بھرپور اظہار موجود ہے جس کا واضح سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد سے اثر قبول کیا اور اپنے عصر کو متاثر کرنے میں بھی خاطر خواہ حد تک کامیاب ہوئی ہیں اگر تواتر سے اُن کا ریاضِ شعر جاری و ساری رہا تو اُن کے سخن سے اُن کے دور کی سنگینی مزید اُجاگر ہو کر سامنے آئے گی۔

☆☆☆☆☆

گل زیب زیبا (کراچی)

جو چاہتوں کے سراب ٹوٹے
تو میری راہوں کے خواب ٹوٹے

کل آئینے میں جو خود کو دیکھا
عجب طرح کے عذاب ٹوٹے

سکوت کتنا ہے زندگی میں؟
وہ آئیں تو کچھ عتاب ٹوٹے

وہ حال پوچھا کیے جو ہم سے
لبوں پہ آ کے جواب ٹوٹے

مثالِ برگِ خزاں ہیں اب تو
نہ جانے کب یہ حباب ٹوٹے؟

گل زیب زیبا (کراچی)

بن ترے شب گزار لی میں نے
کیا قیامت سہار لی میں نے؟

دیکھ اے جانِ جاں تری صورت
لوحِ دل پر اُتار لی میں نے

تیری آنکھیں یہ تیرے لب جن سے
زندگانی اُدھار لی میں نے

آہ اک عمر گروی رکھی تب
دو دنوں کی بہار لی میں نے

مونا شہاب اور نئے شعری امکانات

مشیت نے جسے زرخیز قوتِ متخیلہ ودیعت کی ہو تو وہ پھر افکار کی نئی دنیا کا متلاشی ہوتا ہے وہ شعراء وشاعرات جن کے لیے شاعری کبھی مسئلہ نہیں رہی انہوں نے تخیلات کی نئی تخم ریزی کی ہے وہ فکر کی عمومی ڈگر پر چلنا نہیں چاہتے وہ خیالات کی ایک نئی دنیا بساتے ہیں ان کی سوچ کا تانا بانا روایتی احساسات کے گرد نہیں گھومتا۔ اُردو کے ادبی مراکز سے دوری کے باوجود دنیائے شعروسخن کے دیوانے دنیائے شعر کی ایک نرالی جوت جگاتے ہیں ایسی ہی معتبر شخصیات میں مونا شہاب کا نام بھی شامل ہے جن کا بنیادی تعلق کراچی سے ہے لیکن بسلسلہ درس وتدریس شمالی امریکہ میں مقیم ہیں وہاں ذہنی معذور بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں ان کے ہاں نئے شعری امکانات کی ایک قوسِ قزح ہے جو اپنے رنگ بکھیر رہی ہے ان کے شعری مجموعہ ''صدا جب لوٹ کے آئی'' مطبوعہ 2003ء کے منتخب اشعار بطور استشہادات شاملِ شذرہ ہیں یہ ان کا اولین مجموعہ کلام ہے جو مونا شہاب کے حوالے سے معروف شاعر اپنے تاثرات میں یوں رقمطراز ہیں۔

''امریکہ میں چند شاعرات ایسی ہیں جو اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں مونا شہاب ان ہی میں سے ایک ہیں مونا اپنے موضوعات کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں یہی سبب ہے کہ اپنے عہد کی باشعور شاعرات میں سب سے نمایاں ہیں اور سب سے مختلف نظر آتی ہیں۔''

مونا شہاب کی شاعری میں ایک بھرپور نوعیت کا نسائی احساس بھی جلوہ ریزیاں کرتا دکھائی دیتا ہے میدوں اور امنگوں کی ایک نئی دنیا آباد ہے ان کا تخیل وسعتوں سے ہمکنار نظر آتا ہے محبت اور وفا کے رنگ بھی ہیں خوشبوؤں کا احساس ہے لہجے کی شیرینی ہے وطن سے دوری کے باعث کہیں کہیں جذبۂ حب الوطنی جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے انہیں افکار سے منسوب ان کی ایک پوری

غزل پیشِ خدمت ہے ۔

میں پرواز کرنا چاہتی ہوں
دھنک پر پاؤں دھرنا چاہتی ہوں
زمیں پر دل مرا لگتا نہیں ہے
فضاؤں میں بکھرنا چاہتی ہوں
محبت کی ادھوری داستاں میں
وفا کا رنگ بھرنا چاہتی ہوں
کسی کی راہ کا کانٹا نہیں ہوں
میں خوشبو ہوں بکھرنا چاہتی ہوں
میں اپنی خوش کلامی سے دلوں میں
خوشی بن کر اترنا چاہتی ہوں
مری یہ جاں امانت ہے وطن کی
سو اس کے نام کرنا چاہتی ہوں

ان کے ہاں لطیف اور خوشگوار احساسات اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں رجائی امکانات ہیں جو ایک شانِ دل آویزی لیے ہوئے ہیں نئی آسیں، امیدیں اور امنگیں جلوہ ریز ہو رہی ہیں اس عہد پر آشوب میں اس نوع کے جذبات یقیناً خوش آئیند ہیں ان کی غزل کا مطلع پیشِ خدمت ہے ۔

مجھ کو وہ خواب دیکھنا ہے ابھی
جس کو گھر گھر میں بانٹنا ہے ابھی

وہ مشرقی تہذیب وتمدن کی پروردہ ہیں مشرقی اقدار کی پاسداری ان کے شعری مخزن میں بدرجہا تم ملتی ہے امریکی معاشرت میں رہتے ہوئے بھی وہاں کی چکاچوند انہیں مرغوب نہیں کر سکی وہ اپنی تہذیب پر فاخرانہ ناز دکھائی دیتی ہیں اور انہیں اہلِ زبان ہونے پر ناز ہے وہ

الفاظ کی حرمت اور تقدس کی قائل ہیں ان کی ایک غزل کا مطلع زیب قرطاس ہے۔

مجھے عزیز ہے پرکھوں کی آن بھی تو کیا؟
جو میں ہوں وارث اہلِ زبان بھی تو کیا؟

اُن کے کلام میں رومانوی تخیلات اپنی خالص صورت میں ملتے ہیں محبوب کی آمد پر انہیں ہوا مشکبار اور مزاجِ موسم خوشگوار دکھائی دیتا ہے مجازی حوالے توانا انداز میں پائے جاتے ہیں خیالات فطری ہیں کہیں کہیں طرب کے خوبصورت رنگ جلوہ ریز ہو رہے ہیں مظاہر فطرت کا مذکور بھی ان کے شعری خصائص کا حصہ ہے ان کی غزل کے دو اشعار لائق توجہ ہیں۔

آیا ہے کون کیوں یہ ہوا مشکبار ہے؟
موسم کا بھی مزاج بہت خوشگوار ہے
شبنم نے فرطِ شوق میں موتی لٹائے ہیں
لبریز گل کے ہاتھ میں جامِ بہار ہے

مصرع در مصرع، شعر در شعر، غزل در غزل بین السطور ایک نادرہ کاری اور پرکاری ہے جو قاری کو متوجہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ان کا پیرائیہ اظہار غیر معمولی اور غیر روایتی اہمیت کا حامل ہے خیالات کا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جو ہر آن ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس سے ان کے شعری تموج کی غمازی ہوتی ہے ہر جگہ ایک تہذیبی پیرایہ ایک نئی آن بان میں ملتی ہے تنقیدی رویے عصری رویوں کے روپ میں جلوہ ریزیاں کر رہے ہیں ان کی غزل کے چند اشعار دنیائے شعر وسخن کے متوالوں کی نذر ہیں۔

ساحل پہ آئے موج سمندر کے ساتھ ساتھ
کشتی جلا کے چھوڑ دی لنگر کے ساتھ ساتھ
ماں ہو کے ماں کا دکھ نہ سمجھ پائی وہ کبھی
یہ سانحہ ہے قوم کی دختر کے ساتھ ساتھ

بستی میں ایک ہے خوب حفاظت کا انتظام
کھینچے گئے ہیں خار ہر اک گھر کے ساتھ ساتھ
دل کا بُرا نہیں میرے آنگن میں اس نے آج
پھینکے ہیں چند پھول پتھر کے ساتھ ساتھ
مجھ کو یقیں ہے پھر مری تہذیب کے نقیب
کرنوں کی رتھ پر آئیں گے خاور کے ساتھ ساتھ

اُن کی ایک اور غزل کے چند اشعار بدونِ تبصرہ ملاحظہ کریں ؎

وہ دور شام کا سورج جو ڈھلنے والا ہے
بتا رہا ہے نیا دن نکلنے والا ہے
ہوائیں اس کو بجھائیں گی کس طرح سوچو؟
کہ یہ چراغ تو سینے میں جلنے والا ہے
شجر سے گرے ہیں تو یہ گماں ہے ہمیں
مرے مزاج کا موسم بدلنے والا ہے
وہ مجھ سے پیار سے بولے تو دل میں خوف آئے
کہ کیا وہ اور کوئی چال چلنے والا ہے؟
جو سر اٹھائے کھڑا تھا ہزار صدیوں سے
روایتوں کا دروازہ کھلنے والا ہے

مذکورہ چند استشہادات مشتے از خروارے کے مصداق ہیں ان کے علاوہ بھی ان کے متعدد اشعار ہیں جو حوالے کا استحقاق رکھتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤنا شہاب کے کلام میں بے پناہ نئے امکانات ہیں جو ان کے بہتر مستقبل کی نوید ہیں مزید شعری ریاضت اُن کے سخن کو چار چاند لگا سکتی ہے۔

مونا شہاب (کراچی)

کل جو بچ کے آ گیا تھا تیر سے تلوار سے
آج زخمی ہو گیا ہے وہ زباں کے وار سے

دھوپ سر پر ظلمتوں کی کیا پتہ کب تک رہے؟
تم بھی لگ کے بیٹھ جاؤ سایۂ دیوار سے

بیچ دی غیروں کے ہاتھوں کیوں حمیت آپ نے؟
بس یہی شکوہ ہے مجھ کو آج کی سرکار سے

اب کہاں ہم میں کوئی سالار باقی رہ گیا؟
جو دکھائے معجزہ ٹوٹی ہوئی تلوار سے

اس نے میری ہمتوں کا خون سارا پی لیا
مجھ کو ویرانہ ہے بہتر ایسے لالہ زار سے

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM

مونا شہاب (کراچی)

سوکھی شاخوں کے تن کو گلوں کا حسیں پیرہن دے گئی
جاتے جاتے صبا ہم کو پیغامِ دار و رسن دے گئی

سکھ کے گاؤں میں آ کے جو ٹھہرے کبھی درد کے قافلے
زندگی اپنے ہاتھوں سے خود بام و در کو کفن دے گئی

آج ترکِ محبت کا مجھ کو بھی اتنا ہوا فائدہ
کہ تری بے نیازی مری خامشی کو سخن دے گئی

جب فضاؤں میں بارود اُڑنے لگا سانس گھٹنے لگی
میرے سینے کو بوجھل ہوا اک عجب سی چبھن دے گئی

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ ـــ عشق والفت کی شاعرہ

عشق والفت کے جذبے اقلیمِ سخن کی جان ہوا کرتے ہیں اگرچہ جدید ادبی عصری رویوں نے انھیں مسخ کرنے کی کوشش کی جنھیں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جدت پسندوں کی تمام تر کاوشوں کے باوجود غزل سے رومان کے وجود کو ختم نہ کیا جا سکا یہ جذبے تمام شعرا و شاعرات کے ہاں کم یا زیادہ پائے جاتے ہیں ہم نے جب ڈاکٹر نجمہ شاہینؔ کے دوسرے شعری مجموعہ "میں آنکھیں بند کرتی ہوں" کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ہمیں عشق والفت کے احساسات وفور کے ساتھ نظر آئے مجموعہ ہذا اپریل 2010ء میں منظرِ عام پر آیا ان کا اولین شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو" بھی قارئینِ شعر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے آج ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ "میں آنکھیں بند کرتی ہوں" کے منتخب غزلیہ اشعار کا تجزیہ عشق والفت کے حوالے سے کریں گے اگرچہ انھوں نے بھرپور قسم کی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی غزل ان کی نظم سے کہیں آگے ہے ان کی غزل میں تغزل بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے غزل کا اسلوب انتہائی شستہ، سادہ اور رواں ہے جاذبیت جس کا وصفِ خاص ہے۔

عشقِ حقیقی کے حوالے صوفیاء کے ہاں دو نظریے پائے جاتے ہیں دو مکتبِ فکر ہیں جن کی تصوف سے وابستہ لوگ پیروی کرتے ہیں جنھیں "ہمہ اوست" اور ہمہ از اوست" کا نام دیا جاتا ہے جن کے اصطلاحی مفاہیم یہ ہیں کہ سب کچھ خدا ہے اور ہر چیز اس سے نسبت رکھتی ہے یا اس کا پرتو ہے ڈاکٹر نجمہ شاہینؔ کے ہاں یہ دونوں نظریے پائے جاتے ہیں ان کی حمد کے تین اشعار میں انھیں

افکار کا رنگ پورے کروفر سے پایا جاتا ہے۔

جہاں جہاں گئی نظر ، وہاں وہاں ملا ہے تو
ہر اک جگہ ، ہر اک نگر خدا ہے تو
ہیں رنگ و نور چار سو ترا وجود کو بہ کو
چمن چمن دمن دمن جمالِ دلربا ہے تو
ہر ایک بحر و بر میں تو وجودِ خیر و شر میں تو
ہر ایک سمت جلوہ گر، جہاں میں اے خدا ہے تو

عالمِ ہجراں کرب اور سوز و گداز سے عبارت ہوا کرتا ہے عشق کے لیے یہ کیفیت کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی ہوش و حواس مفقود ہو جاتے ہیں انسان کو اپنی خبر تک نہیں ہوتی یہ عشق کی پُر آشوب کیفیت ہوتی ہے ایک عالمِ جنون ہوتا ہے یہ صورتِ حال اجنبی اور انجان بنا دیتی ہے یہی کرب ان کے ہاں ملاحظہ کرتے ہیں۔

ہجر کی وحشت نے دل کو کر دیا رنجور اب
بھولتی جاتی ہیں اب صورتیں دیکھی ہوئی

رجائیت آمیز شاعری اس دورِ پر آشوب میں ایک ٹانک کا درجہ رکھتی ہے جس کے باعث زندگی کی رعنائی اور توانائی بحال ہے اور معمول کے ساتھ پورے جوش و جذبے سے گزر رہی ہے ہجر کی پُر اذیت وحشت میں بھی دامنِ امید تھامے رکھنا امید افزا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر دیکھتے ہیں۔

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

ہم سب ایک عہدِ بے حسی میں زندہ ہیں جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے جہاں اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہیں خلوص و الفت ناپید ہے بقولِ راقم الحروف۔

کیا خبر کس دیس میں ہم آ گئے؟
پیار عنقا ہے جہاں نفرت فزوں

ہر انسان اپنی ذات کے خول میں مقید ہے اور خود اسیری کی زندگی بسر کر رہا ہے حصارِ ذات نے انسان کو بہت سی خود فریبیوں میں مبتلا کر دیا ہے اور ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ہے اسی حوالے کا حامل اُن کی غزل کا ایک شعر لائقِ التفات ہے۔

ہر ایک اپنی ذات کے حصار میں اسیر تھا
کہ خود فریبیوں میں ہی ہر ایک موجزن ملا

حصولِ محبت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اُس معیار پر لے جائے جہاں پہنچ کر انسان محبت کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے استحقاق جتا سکتا ہے پہلے خود کو وفاؤں کا خوگر کرنا ہوگا پھر انسان کی سوچ یہ ہوگی کہ میرا محبوب بھی میری طرح وفا کا استعارہ ہو جب اُسے ایسی ہستی نہیں ملے گی تو پھر وہ مجبوریاں ہو جائے گا یہی تاثر اُن کے ہاں کچھ یوں پایا جاتا ہے۔

ہم لوگ محبت سے بتا کس کو پکاریں؟
دنیا میں کوئی ہم سا، ہمارا نہیں ملتا

عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ عشق وہ ہے جو انسان کو مجنوں اور دیوانہ بنا دے حواس باختہ کر کے مخبوط الحواس بنا دے اور انسان مجذوب بن جائے یہ عشق کے حوالے سے ایک منفی تاثر ہے جو عشق کے حسین چہرے کو داغدار کر رہا ہے جبکہ اس کی حقیقی صورت یہ ہے کہ عشق ایک عنبر ہے ایک خوشبو ہے جو تن من کو مہکائے رکھتی ہے جیسے اقبال نے کہا تھا۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا فکر و فن

محبوب حسن اور احساسِ حسن کا مرقع ہوتا ہے یہی سبب ہے وہ محبّ سے وفا کرنا لازمی نہیں گردانتا لیکن محبّ پل پل اُس کی یادیں دل میں بسائے پھرتا ہے عشق کا روگ بھی عجیب و غریب

ہے جو تغیرِ حال کا باعث بنتا ہے اگر عشق کامیاب ہوجائے تو صحرا کو گلزار بنانے پر قادر ہے اگر ہزیمت سے دوچار ہو تو پھر گلزار کو صحرا میں ڈھال دیتا ہے عشق کے اندر ایسی خصوصیت ہے کہ یہ انسانی روح کو جلا بخشتا ہے عشق کی مثال ایک چراغ کی مانند ہے جو تیرگی اور شبِ ظلمت کے راج کو ختم کرتا ہے اس حوالے سے اُن کی غزل کے چار اشعار ہدیۂ قارئین ہیں۔

وہ آواز ، وہ لہجہ اس کے خال و خد
کس کی یاد میں من مہکائے پھرتی ہوں
جو مجھ کو پہچان نہ پایا آج تلک
دل میں اُس کی یاد بسائے پھرتی ہوں
عشق کا روگ بھی روگ عجیب سا ہوتا ہے
صحرا کو گلزار بنائے پھرتی ہوں
شاہیںؔ اس سے روشن میری روح بھی ہے
میں جو ایک چراغ جلائے پھرتی ہوں

ڈاکٹر نجمہ شاہینؔ کی شاعری سے قاری کو ایک خوشگوار اور لطیف احساس ہوتا ہے آج کے پرآشوب عہد میں جہاں آس اور امید کی شمعیں گل ہوچکی ہیں اس بھیانک صورت حال میں بھی رجائی جذبوں کی پاسداری یقیناً خوش آئند اور مستحسن اقدام ہے جس سے زندگی کو نیا ولولہ، نیا حوصلہ اور نیا جوش و جذبہ عطا ہوتا ہے اُن کے ہاں یہ فکری تلازمے بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں وہ درسِ امید دے رہی ہیں اور رجا کی شمعیں روشن کررہی ہیں وہ ذاتی حوالے سے بات کر کے اجتماعی تاثر پیدا کرتی ہیں اس طرح ذات سے لے کر کائنات تک کا سفر جاری رہتا ہے اُن کی غزل کا ایک رجائیت آمیز شعر آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

میں اپنے آنگن کو دے رہی ہوں نئے اُجالے
وہ میری راہوں میں پھول کلیاں بچھا رہا ہے

اُن کے کلام میں عشق و الفت کا جذبہ اپنے خالص روپ میں موجزن ہے جہاں غم کی ہلکی سی آنچ ہوتی ہے وہاں امید افزا کیفیات بھی موجود ہوتے ہیں وہ اپنے شعری احساسات میں وفا کے اعلیٰ و ارفع مقام پر دکھائی دیتی ہیں محبت میں محبوب پر اندھا اعتماد کیا جاتا ہے اُس کی ہر غلط بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ یہ معاملہ خرد کا نہیں ہے بلکہ عشق و جنوں کا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ۔

وفا میں اب یہ ہنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے

وہ بھی اپنے محبوب کی ہر بات کا یقین کرتی ہیں اور اسے من و عن تسلیم کرتی ہیں اُن کی غزل کے اسی شعر میں اُن کی وفا کا رنگ دیکھتے ہیں ۔

بات جو نہیں سُنتا اُس سے بات کرتی ہوں
اُس پہ ہے یقیں مجھ کو جو گمان جیسا ہے

اُن کے ہاں کہیں کہیں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے لیکن غمِ جاناں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود رہتا ہے اور اسے فوقیت حاصل رہتی ہے اسی حوالے سے ان کی غزل کا مطلع لائقِ توجہ ہے ۔

دن تو اپنے غمِ دوراں میں گزر جاتے ہیں
شام ہوتے ہی ترے غم میں بکھر جاتے ہیں

اُن کے ہاں رومان کے سارے رنگ پائے جاتے ہیں جن میں کیفیاتِ دل بھی ہیں اور وارداتِ دل بھی ۔ عشق و عاشقی کے تمام رنگ موجود ہیں ان کے کلام کے مطالعے کے بعد قاری ایک لطیف اور خوشگوار احساس میں کھو جاتا ہے ان کے ہاں مجاز معتبر، مستقل اور تندرست و توانا حوالے کے طور پر پایا جاتا ہے ان کا کلام دل زدوں کے لیے ایک سامانِ دل بستگی ہے ان کے ہاں محبت کے جذبات و احساسات مکمل اخلاص کے ساتھ پائے جاتے ہیں مصرعوں کے دروبست میں ایک حسنِ التزام ہے اسلوب میں ایک چاشنی اور شیرینی موجود ہے غم کے ساتھ ساتھ خوشی کا ایک

خوشگوار احساس بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے جس کے باعث غم کی شدت کم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تصورِ محبوب ایک مرکزی تلازمے کے طور پر ابھرا ہے محبوب کے بغیر وہ ہستی کو ہستی نہیں گردانتی محبوب کے بغیر خوشی کا تصور نا پید ہے اُن کے رجا کا عالم یہ ہے کہ انھیں عالمِ ہجراں میں بھی ایک دلکشی کا پہلو دکھائی دیتا ہے اُن کے نزدیک ذکرِ یار کے بغیر شاعری نہیں ہوتی انھیں خیالات کے حامل اُن کی غزل کے چار اشعار آپ کے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لیے زیبِ قرطاس ہیں۔

تم سے گر دوستی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

تم تبسم ہو میرے ہونٹوں کا
بن تمہارے ہنسی نہیں ہوتی

وحشتِ ہجر گر نہ مل پائے
زیست میں دلکشی نہیں ہوتی

ذکر اُن کا اگر نہ شامل ہو
ہم سے پھر شاعری نہیں ہوتی

اُن کے اسلوب کی سادگی ہی اُن کے کلام کا حسن ہے انھوں نے نسبتاً رواں دواں بحور میں لکھا ہے جن میں ایک خاص آہنگ اور موسیقیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اُن کے نزدیک محبت غمِ دوراں کو بھلانے کا حسین طریقہ ہے وہ اہلِ دل ہیں اُن کا تعلق دل کی دنیا سے ہے وہ زندہ دلی سے زندگی گزارنا چاہتی ہیں بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح۔

زندگی زندہ دلی سے جو گزاری ہم نے
موت بھی دے کے ہمیں جامِ بقا گزرے گی

اسی تناظر میں اُن کی غزل کا مطلع پیش ہے۔

آؤ کہیں یہ بزمِ محبت سجائیں ہم

غم ہائے روزگار ذرا بھول جائیں ہم

اُن کے ہاں معاملہ بندی بھی ہے اور منظر نگاری بھی پائی جاتی ہے اُن کے ہاں وصل کے قصے بھی ہیں اور ہجر کے فسانے بھی ہیں عمومی محبتوں کا فقدان بھی ماضی کی دلکشی بھی ہے اور حال کا وجدان بھی ہے کہیں وہ خوش وخرم نظر آتی ہیں تو کہیں شکوہ کناں ہیں اس سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر اُن کی غزل کا ایک دل گداز شعر آپ کی نظر ہے۔

وہ قربت کی باتیں، وہ مہکی سی راتیں کہاں کھو گئیں ہیں؟

محبت کی پونی کہاں جا کے کاتیں دھا رو رہی ہے؟

مشمولہ توضیحات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کا کلام فکری وفنی اعتبار سے لائقِ اعتنا وصد ستائش ہے اسلوبیاتی جاذبیت اُن کے کلام میں اور دلکشی بنا رہی ہے اُن کے ہاں کہیں کہیں نسائی احساسات وخیالات بھی پائے جاتے ہیں اگر رومانی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی، احمد فراز اور ابوالفیان ظہور احمد فاتح کی صف میں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اُن کے کلام میں بہت سے روشن امکانات موجود ہیں جو اُن کے بہتر ادبی مستقبل کی بشارت دے سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (ڈیرہ غازی خان)

شام کی دہلیز پر لیں درد نے انگڑائیاں
جاگ اٹھے ہیں غم سبھی اور روپڑیں تنہائیاں

راستوں پر خاک ہے پھولوں سے خوشبو کھو گئی
دن کا اب امکاں نہیں ہے کھو گئیں رعنائیاں

جب وفا گھائل ہوئی دنیا میں جب سائل ہوئی
گم ہوئی خوشیاں سبھی ، ہم کو ملیں رسوائیاں

ایسے تحریریں مٹیں اور ساری تنویریں بجھیں
ہچکیوں کی ہے اخیر اب سو گئیں پروائیاں

بے بسی کی شام پر سسکی ہے پہروں زندگی
خواب کی خواہش میں ہم تو کھو چکے بینائیاں

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ (ڈیرہ غازی خان)

روشنی کرنی تھی جس نے وہ دھواں کرتا گیا
رنج و غم کو وہ مرا کیوں آسماں کرتا گیا؟

زعم تھا وہ پاسباں دل کا ہے دل کے ہی قریب
پر مرے دل کو وہ کیسے بدگماں کرتا گیا؟

جو مجھے گلزار کرنا چاہتا تھا دیکھیے
مجھ کو ویراں کر کے خود کو گلستاں کرتا گیا

کیا خبر تھی ایک دن کر دے گا زخمی روح کو؟
کام دشمن کا تھا جو اک مہرباں کرتا گیا

وہ کہانی کا عجب کردار تھا شاہین جو
وہ حقیقت تھی مجھے ہی داستاں کرتا گیا

نجمہ عثمان کی شعری حسیات

حیاتِ انسانی میں حواسِ خمسہ کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے فنونِ لطیفہ میں ان کا کردار کلیدی و مرکزی نوعیت کا حامل ہے فنِ شعر گوئی میں سخن گستر کی فکری و فنی حساسیت خصوصی اہمیت رکھتی ہے اگر اس کا استعمال گہرائی و گیرائی کے ساتھ ہو تو رفعت و ندرت آشکار ہوتی ہے اگر عمومی انداز میں ہو تو فطری اظہار کو فروغ نصیب ہوتا ہے سخن داں کی ذاتی حسیات اگر نادر النظیر ہوں تو ایک انفرادیت افکار سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بہت ہی کم شعراء و شاعرات کے ہاں عمیق حساسیت کی تمثیلات ملتی ہیں ان معدودے چند ناموں میں ایک نام نجمہ عثمان کا بھی ہے جن کی فکر بسیط حساسیت کی غماز ہے شذرہ ھذا میں ہم نجمہ عثمان کی سخن سنجی کے حوالے سے رفتطراز ہیں ان کے شعری مجموعہ، ''کڑے موسموں کی زد پر'' کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں مجموعہ ھذا کا نام بھی عصری بے حسی کا غماز ہے جس سے ان کا عصری رویوں کے حوالے سے ایک فطری شعور جلوہ نما دکھائی دیتا ہے مذکورہ مجموعہ کی اشاعت اپریل 1999ء میں عمل میں آئی جس پر شاہدہ حسن اور احمد ہمدانی کی آراء ثبت ہیں۔

تخلیق کار کا رشتہ اپنی دھرتی، اپنے دیس اور اپنی جنم بھومی سے مضبوط بنیادوں پر استوار رہتا ہے جس کی یادیں ایک سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں اجنبی دیسوں کے سفر میں انسان کو یہ یادیں پل پل ستاتی ہیں اور انسان ایک جاں گداز اور جاں سوز عمل سے گزرتا ہے نجمہ عثمان کا اگرچہ بنیادی طور پر تعلق تو کراچی سے ہے مگر اس وقت وہ یو کے میں مقیم ہیں ان کے افکار انہیں احساسات سے

مرسع ہیں ان کے کلام میں ایک گھریلو زندگی کا شعور جلوہ گر نظر آتا ہے صنفِ نازک ہونے کی حیثیت سے بنتِ حوا کے مصائب و آلام کا مذکور بھی ان کے خیالات کا ایک نمایاں وصف ہے کنوارے پن کی حسین یادیں اور میکے کے حسین تصورات بھی ان کے اشعار کے پردے میں جھانکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں انہیں تخیلات کی ترجمانی نجمہ عثمان کی زبانی ان کی ایک غزل کے دو اشعار میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

گھر کی مٹی مری نظر میں رہی
اور میں اجنبی سفر میں رہی
بیٹیوں کی ہری بھری سی ہنسی
اپنے میکے کے بام و در میں رہی

بسا اوقات انتہائی سادہ اور شستہ انداز میں گہری رمزی باتیں ان کے ہاں ملتی ہیں جن میں ایک عمیق فلسفہ پنہاں ہوتا ہے ان کے ہاں روح عصر کی بھرپور عکاسی ملتی ہے تنقیدی اور رجائی رویے بھی ان کے افکار کا حصہ ہیں اسی پس منظر میں ان کی ایک غزل کا مطلع لائق توجہ ہے۔

دائرہ روشنی کا مدھم ہے
تیل شاید چراغ میں کم ہے

ان کے ہاں نسائی احساسات کا فروغ بھی ہے جس کے باعث عورت شناسی کا شعور ملتا ہے جس میں عورت کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم پنہاں ہیں بچپن کی حسین یادوں کا اظہار دلکش پیرائے میں ملتا ہے اسی نسبت سے ان کی ایک غزل کے چار اشعار دیدنی ہیں۔

ہاتھ میں جب حنا رچی ہوگی
جانے کیا کچھ وہ سوچتی ہو گی؟
میرے بچپن کی ننھی منی بیل

کس کے آنگن میں پھیلتی ہو گی؟
اب جو ہر رنج جھیلے جاتی ہے
کبھی نازک سی اک پری ہو گی
ننگے پاؤں چلی وہ مٹی پر
یاد بچپن کی آ گئی ہو گی

ایک بچے اور کمسن تخلیق کار کی طرح ان کے ہاں صداقتوں کا فروغ ہے وہ زیست کی ظلمتوں سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں وہ شبِ تیرہ کی تیرگی کے خلاف معرکہ آرا دکھائی دیتی ہیں وہ خلت کے اندھیروں میں صداقت کے اجالوں کی تخم ریزی کر رہی ہیں ان کے افکار میں صداقتوں کی پیوند کاری ایک مستحسن اقدام ہے اسی حوالے سے ان کی ایک غزل کا ایک شعر زینتِ قرطاس ہے۔

سنو میں زندگی کی ظلمتوں میں
صداقت کے اجالے بو رہی ہوں

وہ اپنی قوتِ متخیلہ کے بل بوتے پر داخلی اظہار کی راہیں ہموار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ان کی دروں بینی ان کی داخلیت کی عکاس ہے خلوتوں میں بھی جلوتوں کا سماں نظر آتا ہے کیونکہ وہ اپنے دروں میں محفل سجائے رکھتی ہیں اور اپنے اندر کی بازگشت کو بغور سنتی ہیں ان کے احساسات ان کی بھرپور داخلیت کی غمازی ہوتی ہے۔

کسی تنہائیوں میں بیٹھی ہوں
اپنے اندر کا شور سنتی ہوں

اُن کے افکار میں حزن وطرب کے یکساں پہلو دکھائی دیتے ہیں غم والم سے ایک موانست کا جذبہ ہے جو انتہائی دلچسپ انداز میں ملتا ہے جہاں مصائب و آلام انہیں حسیں صورت میں نظر آتے ہیں ان کی متلوّن مزاجی طبیعت کی خوشگواری کے بہانے ڈھونڈتی ہے بچپن کا معتبر اور مستقل

حوالہ ہے ان کی غزل کے دو اشعار دامنِ دل تھام رہے ہیں۔

یاسیت کے رنگ آنکھوں کو مری بھانے لگے
صحن اپنا زرد پھولوں سے سجا اچھا لگا
یاد آئیں اپنے بچپن کی کئی یادیں مجھے
ایک بچہ بے تکلف بولتا اچھا لگا

متذکرہ توضیحات وتصریحات اس امر کی غماز ہیں کہ نجمہ عثمان کی شعری حساسیت عمیق وبسیط ہے جس کی بدولت ان کے فکری وفنی خدوخال اُجاگر ہوئے ہیں مزید معیارات کی بازیافت کے لیے انہیں اپنی شعری ریاضت تسلسل سے جاری رکھنی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

نجمہ عثمان (کراچی)

مسافروں کی رات کیا جہاں رکے گزر گئی؟
مسافتوں کے باب میں اک اور دن گزر گیا

میں آنسوؤں میں ڈوب کے سراپا ناز بن گئی
وہ چند مسکراہٹیں جو میرے نام کر گیا

میں پور پور زخم تھی مگر ہری بھری رہی
وہ پھول پھول شاخ سے جدا ہوا تو مر گیا

کچھ ایسا تلخ بھی نہ تھا مرا فسانۂ الم
مگر قلم کی نوک میں یہ کون زہر بھر گیا

مکاں پر رنگ تھا نیا پرانے چہرے خاک تھے
وہ مدتوں کے بعد جب پلٹ کے اپنے گھر گیا

نجمہ عثمان (کراچی)

عذاب کتنے اُٹھائے ہیں اک خوشی کے لیے؟
چھلک پڑا ہے لہو آنکھ سے ہنسی کے لیے

میں ایک عمر سے ہوں اس طرح چراغ بدست
کہ انگلیاں بھی جلالی ہیں روشنی کے لیے

مجھے تو رشتۂ جور و ستم بھی ہے منظور
تمہیں بھی کاش سلیقہ ہو دشمنی کے لیے

چھپے تھے چاند ستارے گزشتہ رات کہاں؟
بہت اُداس دریچے تھے چاندنی کے لیے

اُداس اُداس گزارو گی زندگی کب تک؟
بس اک خوشی سے جیئے جاؤ زندگی کے لیے

نسیم آراء کی اضطرابیہ شاعری

فطری طور پر بنی نوع انسان کو دیگر مخلوقات کی نسبت عمیق حسیات ودیعت کی گئی ہیں قدرت نے جسے تخلیقی اظہار کے وصف سے نوازا ہو اس میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے طبعی اضطراب گہری حساسیت کا غماز ہوتا ہے یہ وہ وصف عجیب ہے جس کے باعث داخلی اظہار کو فروغ ملتا ہے جو لوگ داخلیت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ان کے ہاں اضطرابی کیفیات مشاہدہ کی جا سکتی ہیں اضطراب اگرچہ ایک داخلی کیفیت ہے لیکن یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے جو شاعر کو مقبولیت و پذیرائی کی دوامی خصوصیت عطا کرتا ہے اس کی جھلک تمام شعراء و شاعرات کے ہاں کم و بیش پائی جاتی ہے آج ہم کراچی سے تعلق رکھنے والی معروف شاعرہ نسیم آرا کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کا کلام اضطرابی کیفیات سے مملو ہے جنھوں نے اردو اور پنجابی زبان میں طبع آزمائی کی ہے ان کے شعری مجموعہ "اضطراب" کے چند غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں کتاب ھذا کی طباعت 2009ء میں عمل میں آئی مجموعہ ھذا کے حوالے سے محسن احسان، عقیل احمد، فضا اعظمی، جمال نقوی، انوار الحق صدیقی اور پروفیسر سحر انصاری کی آراء ثبت ہیں اس سلسلے میں انوار الحق صدیقی گویا ہیں "محترمہ نسیم آرا، امید و بیم، منفی سے مثبت تکلیف سے راحت کا سفر اپنی غزل میں پہلو در پہلو اضطراب روح کو حسن معنی سے بہرہ ور کرتی ہیں یہ اضطراب ان کی نظموں میں تسلسل اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح کی گہرائی میں ایک ہمہ جہت تاثر پیدا کر دیتا ہے۔

نسیم آرا کے ہاں حب الوطنی کے شواہد بکثرت ملتے ہیں وہ وطن کی محبت کے جذبے سے

سرشار ہیں جس کی جھلک ان کے افکار میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے وطن اور ہم وطنوں کا دکھ درد ان کے اشعار میں بھرپور انداز میں ملتا ہے اس سلسلے میں ان کی ایک مسلسل غزل ملاحظہ کریں۔

اس سرزمینِ پاک کی وحدت کو کیا ہوا؟
دو لخت ہو گئی جو اخوت کو کیا ہوا؟
اُجڑا ہوا چمن در و بام منہدم
میرے تصورات کی جنت کو کیا ہوا؟
قول دے کے باب ظلم کو سمجھے تھے بند ہوا
پھر بہہ رہا ہے خون کی ضرورت کو کیا ہوا؟
وہ بزم جس میں اپنی اخوت کی دھوم تھی
اس انجمنِ ناز کی زینت کو کیا ہوا؟
بکھرے ہوئے خیال و سہا ہوا کلام
اب کیا کہے تبسم طبیعت کو کیا ہوا؟

اُن کا اضطراب انفرادی اور اجتماعی ہر حوالے سے ممتاز و ممیز ہے ان کے ہاں انفرادی حوالوں کی نسبت اجتماعی حوالے بکثرت ملتے ہیں کلام میں عصری آشوب جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری اور عصری بے حسی کے شواہد ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

جذبوں کی صداقت کا ہم کتنا بھرم رکھتے؟
آئینِ وفا نے تو مظلوم تراشے ہیں

زیست کی سانسیں اور شب و روز کے تسلسل کو وہ حزن و الم سے مربوط گردانتی ہیں فطری طور پر انہیں غم سے مفر مطلوب ہے اور اس سے رستگاری کی خواہاں ہیں جس کے باعث اُن کے تخیلات میں یاسیت کے پہلو بھی اُجاگر ہوئے ہیں۔

یہ زندگی کے جھمیلے ہیں کم نہیں ہوں گے
فضا وہ ہوگی کہاں جس میں غم نہیں ہوں گے؟

وہ زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانا چاہتی ہیں اور اس حقیقت کی متلاشی ہیں اس لیے ان کے ہاں زندگی غم کے روپ میں جلوہ ریز ہوئی ہے یہی سبب ہے کہ وہ سراپا سوال دکھائی دیتی ہیں ۔

زندگی جانے کہاں ہے زندگی؟
کون جانے کیوں گراں ہے زندگی؟

حیات کے پر پیچ سفر میں وہ اس کی کٹھنائیوں کی داستاں رقم کر رہی ہیں اسی حوالے سے وہ کسی قسم کی قربانی سے گریز نہیں کرتیں کیونکہ زندگی کا عکس جمیل دیکھنا چاہتی ہیں جہاں خوشی کو زوال نہ ہو اور غم کو حاصل کمال نہ ہو بسا اوقات ان کا پیرائیہ اظہار انقلابی صورت اختیار کر جاتا ہے اسی حوالے سے ان کی غزل کے دو اشعار دق الباب کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔

رنگینیٔ حیات کے ارمان دیکھیے
اپنے لہو میں آپ نہاتے ہوئے گئے
ہو دور کچھ تو راہِ حوادث کی تیرگی
ہم آپ اپنے گھر کو جلاتے ہوئے گئے

ان کے ہاں غم کی رفاقت کا ایک تسلسل ہے خوشیوں کے جھمیلوں میں بھی وہ اداس دکھائی دیتی ہیں ان کا حزن و اضطراب لازوال نوعیت کا حامل ہے ۔

جب خوشی آس پاس ہوتی ہے
کیوں طبیعت اداس ہوتی ہے

کلام میں اسلوب کی چاشنی ہے مضمون آفرینی ہے اور اضطراب عالم شباب کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ان کا طرز اظہار فطری نوعیت کا حامل ہے جس میں قاری کے لیے دلچسپی کے بے پناہ آثار موجود ہیں ان کا کلام نسائی شعری ادب کی ایک منفرد آواز ہے مسلسل ریاضت کی بدولت ان کا فکر و فن رفعتوں سے ہمکنار ہو گا ۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نسیم آرا (کشمیر)

آئی ہے آئے موت احتراز کیوں کریں؟
اس بے ثبات دنیا پہ ہم ناز کیوں کریں؟

اپنی خوشی سے اُڑ نہ سکے ایک دن بھی ہم
صیاد کہہ رہا ہے تو پرواز کیوں کریں؟

سمجھی ہوں تیری بات بہت خوب مگر دوست
انجام ہے معلوم تو آغاز کیوں کریں؟

خود ہی چھپ کے رکھ نہیں سکتے جو اپنا راز
ہم کو قسم دلا کے وہ ہمراز کیوں کریں؟

دنیا سے کیوں کہیں بھلا ہم اپنے دل کی بات؟
اور اختیار غم زدہ انداز کیوں کریں؟

چپ چاپ چلے جاتے ہیں سوئے عدم نسیم
چونکائیں کیوں کسی کو ہم آواز کیوں کریں؟

نسیم آرا (کشمیر)

مجھ پہ قسمت کی یہ کیا بیداد ہے؟
اے خداوندا مرے فریاد ہے

روح میں کانٹے چبھے جاتے ہیں کیوں؟
دل پہ کیسی آ پڑی افتاد ہے

نوچ ڈالے پر مرے صیاد نے
اب یہ کہتا ہے کہ تو آزاد ہے

جو فنا ہی ہو گیا بدلے گا کیا؟
مجھ کو اب تیرے سوا کیا یاد ہے؟

میرے دل کی دھڑکنوں سے پوچھ لو
کون ان میں ہر گھڑی آباد ہے؟

کس طرح گزریں گے دن باہم نسیم؟
ساتھ یہ مجموعۂ اضداد ہے

شبیر ناقدؔ کے سوانحی اور فنی کوائف کا اجمالی تعارف

شاعر علی شاعرؔ (کراچی)

اصل نام غلام شبیر اور ادبی نام شبیر ناقدؔ ہے۔ یکم فروری 1976ء کو جنوبی پنجاب کے مردم خیز خطے ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل تونسہ شریف کے گاؤں ہیرو شرقی میں پیدائش ہوئی۔ عہد طفولیت میں ہی طبیعت لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئی۔ گویا فطری طور پر علم و ادب کا ذوق مشیت سے ودیعت ہوا۔ عام بچوں کی طرح کھیل کود کے مشاغل میں اُن کی دل چسپی انتہائی کم رہی۔ لیل و نہار کا بیشتر حصہ حصولِ علم میں صرف ہوا۔ میٹرک کا امتحان 1992ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہیرو شرقی سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔ 1994ء کو گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ تونسہ شریف سے ڈی کام کیا۔ شاعری کا بے ضابطہ آغاز تو نویں جماعت سے ہی ہو گیا تھا۔ اوّلاً انگریزی، اردو اور سرائیکی زبان میں طبع آزمائی کی۔ Beauty، ٹیپو سلطان اور حریت اُس دور کی معرکۃ الآراء نظمیں ہیں، لیکن سخن سازی کا باضابطہ آغاز 1996ء میں کیا اور ادبی فیض ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ سے پایا۔ شبیر ناقدؔ کا شمار پروفیسر ظہور احمد فاتحؔ کے اُن تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے استادِ گرامی سے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اُن کی بسیار گوئی بھی اپنے اُستادِ محترم سے کچھ نہ کچھ حد تک مماثلت رکھتی ہے۔ اُن کی پُر گوئی کا یہ عالم ہے کہ اُن کے ابھی تک تین شعری مجموعہ ہائے کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں، لیکن اُن کے غیر مطبوعہ کلام سے

ایک درجن شعری مجموعے بآسانی ترتیب پا سکتے ہیں۔ زبان وادب کی خدمت کو روح کی ریاضت گردانتے ہیں۔ اس لیے بلاامتیاز شام وسحر گلشنِ شعروادب کی آبیاری میں منہمک رہتے ہیں۔ ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُن کے معمولاتِ ادبی خدمات سے عبارت ہیں۔ اگر کوئی تلمیذِ ادب راہ نمائی کا خواست گار ہو تو بہ صد خلوص اُس کی حاجت کشائی کرتے ہیں۔ اُن کے شب وروز اُن کی ادب سے وابستگی کے جنون کی حد تک غماز ہیں۔ گویا شبیر ناقدؔ راہِ ادب کے اُن تھک راہی ہیں جو خلوص اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں، اس سلسلے میں وہ اپنے آرام اور صحت کی بھی پروا نہیں کرتے۔

جولائی 1999ء میں اُنھوں نے پاک آرمی میں شمولیت اختیار کی۔ تادمِ تحریر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ 2001ء کو بی اے کا امتحان بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان سے نجی طور پر پاس کیا۔ 2003ء کو جامعہ ہٰذا سے اُردو ادبیات میں ایم اے کیا اور 2007ء کو مذکورہ یونیورسٹی سے پنجابی ادبیات میں ایم اے کیا۔

دسمبر 2007ء میں اُن کا اوّلین اُردو شعری مجموعہ ''صلیبِ شعور'' جو غزلیات ونظمیات پر مشتمل تھا، منصۂ شہود پر آیا۔ اپریل 2010ء میں اُن کا سرائیکی مجموعۂ کلام ''من دی مسجد'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا، جس میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات اور دوہڑے شامل تھے۔ اپریل 2011ء میں اُن کا دوسرا اُردو شعری مجموعہ ''آہنگِ خاطر'' منظرِ عام پر آیا، جس میں نظم کی اکثر و بیشتر ہیئتوں اور غزل پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ نظم کے پہلو بہ پہلو نثر میں ریاضت بھی تواتر سے جاری وساری ہے۔ اُن کی شعری ونثری تخلیقات ملک بھر کے ادبی جرائد اور اخبارات ورسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ جون 2013ء میں اُن کی ایک نثری اور تنقیدی تصنیف ''ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ کا کیفِ غزل'' سے معنون زیورِ طباعت سے ہم آغوش ہوئی، جس میں اُنھوں نے اپنے اُستادِ گرامی ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ کی شخصیت اور اُن کے ایک درجن سے زائد شعری مجموعوں کی مشمولہ غزلیات کا انتہائی منطقی اور استدلالی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے، جس میں اُن کے نقدِ فن کا جوہر کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ جون 2013ء میں ہی ''شاعراتِ ارضِ پاک'' (حصہ اوّل) سے

موسوم تنقیدی مضامین ومنتخب کلام کا مجموعہ شائع ہوا، جس میں دو درجن شاعرات کے حوالے سے تنقیدی شذرات شامل ہیں، جس میں سکہ بند نقادِ موصوف نے اپنی تنقیدات کے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن کی من حیث المجموع تصانیف کو علمی وادبی حلقوں میں نگاہِ استحسان سے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں بہت ہی قلیل عرصے میں بے پناہ مقبولیت وپذیرائی میسر آئی، جو اُن کی شبانہ روز محنتِ شاقہ کا ثمرہ ہے۔ نیٹ کے قارئین ''اُردو سخن ڈاٹ کام'' پر اُن کی تصانیف سے استفادہ اور اکتسابِ فیض کر سکتے ہیں۔

آج کل شبیر ناقد پاکستان کی شاعرات پر تنقیدی وتحقیقی نوعیت کا کام کر رہے ہیں، اُن کے مضامین میں تحقیق کی نسبت تنقید کا عنصر غالب رہتا ہے۔ گویا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شبیر ناقد اسم بامسمّٰی ہیں۔ وہ ایک فطری نقاد ہیں۔ مشیت نے انہیں طبیعت ہی تنقیدی نوعیت کی ودیعت کی ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے کلام اور گفتگو میں بھی تنقیدی رویے وفور سے ملتے ہیں۔ کتاب ھٰذا ''شاعراتِ ارضِ پاک'' (حصہ سوم) کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے، جس کے مطالعہ کے بعد قارئین اور اربابِ دانش، مصنف، موصوف کی عرق ریزی کا اندازہ بہ خوبی لگا پائیں گے۔ اُن کی تنقیدی حوالے سے درج ذیل کتب زیرِ طبع ہیں۔

۱۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام

۲۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منثور نظم (نظمیات کا تجزیہ)

۳۔ نقدِ فن (تنقیدی مضامین)

۴۔ تجزیات (تنقیدی مضامین)

۵۔ توضیحات (تنقیدی مضامین)

۶۔ زاویے (تنقیدی مضامین)

۷۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین)

۸۔ زیبِ ادب، زیب النسا زیبی (شخصیت اور فن ایک مطالعہ)

علاوہ ازیں بچوں کے لیے شاعری بھی کرتے ہیں۔ اُن کا کلام ملک بھر کے بچوں کے رسائل کی زینت بنتا رہتا ہے۔ شبیر ناقدؔ نے بہت ہی کم عرصے میں اپنے آدرش میں وسعت پیدا کی ہے۔ تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ طبعاً سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں، مگر بے تکلفی اُنہیں بہت پسند ہے۔ اُنہیں یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ اُن کی حیات پُر سعی علمی و ادبی اور عسکری خدمات میں صرف ہو رہی ہے۔ قارئین کرام اُن کے کلام کی وزٹ ''اُردو پوائنٹ'' اور ''یوٹیوب'' پر بھی کر سکتے ہیں۔

الغرض شبیر ناقدؔ راہِ ادب کے ایک اَن تھک مسافر ہیں، جو خلوص، محبت اور لگن پر یقین رکھتے ہیں۔ ریاضت جس کا کلیدی تلازمہ ہے۔ ربِ ادب سے استدعا ہے کہ اُن کے فکر و فن کو دوامِ دوام سے نوازے۔ آمین

شبیر ناقد کی دیگر تصانیف

شاعری

۱۔	صلیبِ شعور	(غزلیات و نظمیات)	
۲۔	من دی مسجد	(سرائیکی غزلیں، نظمیں، گیت، قطعے، دوہڑے)	
۳۔	آہنگِ خاطر	(غزلیات، نظمیات، گیت، ہائیکو)	
۴۔	جادۂ فکر	(غزلیات و نظمیات)	زیرِ طبع
۵۔	صبحِ کاوش	(غزلیات و نظمیات)	زیرِ طبع
۶۔	روح دی روہی	(سرائیکی غزلیں، نظمیں، قطعے، دوہڑے)	زیرِ طبع
۷۔	دل سے دور نہیں ہو تم	(غزلیات و نظمیات)	زیرِ طبع
۸۔	کتابِ وفا	(غزلیات و نظمیات)	زیرِ طبع

تنقید

۱۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل (شخصیت اور فن)

۲۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اوّل) (تنقیدی مضامین، منتخب کلام)

۳۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ دوم) (تنقیدی مضامین، منتخب کلام)

۴۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) (تنقیدی مضامین، منتخب کلام)

۵۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) (تنقیدی مضامین، منتخب کلام، زیرِ طبع

۶۔ فکر و فن (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۷۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم (نظمیاتی تنقیدی تجزیہ) زیرِ طبع

۸۔ تجزیات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۹۔ زاویے (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۰۔ توضیحات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۱۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

۱۲۔ زیبِ ادب زیب النسا زیبی (شخصیت اور فن ایک مطالعہ) زیرِ طبع

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو ڈاٹ کام

مذہبِ عشق

(کلیاتِ صابر ظفر)

(ابتدائی دس مجموعہ ہائے غزل)

۱۔	ابتداء		۱۹۷۴ء
۲۔	دھواں اور پھول		۱۹۸۵ء
۳۔	دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے		۱۹۹۰ء
۴۔	دکھوں کی چادر	فروری	۱۹۹۴ء
۵۔	پاتال	جنوری	۱۹۹۶ء
۶۔	بارہ دری میں شام	جون	۱۹۹۶ء
۷۔	اک تری یاد رہ گئی باقی	جنوری	۱۹۹۸ء
۸۔	عشق میں روگ ہزار	اگست ۱۹۹۸ء	
۹۔	بے آہٹ چلی آتی ہے موت		۱۹۹۹ء
۱۰۔	چین اک پل نہیں	جولائی	۲۰۰۰ء

صفحات 800 قیمت =/800 روپے

رنگِ ادب

رابطہ.....0345-2610434

5۔ کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن

شاعراتِ ارضِ پاک

(حصہ چہارم)

پاکستان کی 100 شاعرات کے تذکرہ

اور منتخب کلام پر مشتمل ہوگا

رنگِ ادب پبلی کیشنز کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب شاعر علی شاعرؔ نے پاکستان سے تعلق رکھنے والی سینئر و جونیئر تمام شاعرات کے فن اور منتخب کلام کو متعدد جلدوں میں شائع کرنے کا عزم کیا ہے، جس کے لیے جناب شبیر ناقدؔ کی خدمات اور علم سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

جناب شبیر ناقدؔ شاعرات کے فن کا جائزہ بھی لیں گے اور شاعرات کا منتخب کلام بھی پیش کریں گے، جس کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر جلوہ گر کرنے کا کام ادارہ ''رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی'' سر انجام دے گا۔

آپ سے گزارش ہے، اپنا تعارف، مجموعۂ غزل/نظم یا دس غزلیں شبیر ناقدؔ تک پہنچانے کے لیے اُن کے موبائل نمبر پر جلد از جلد رابطہ فرمائیں۔ شکریہ.....

شبیر ناقدؔ

0332-6224541

THE HOUSE OF URDU LITERATURE WWW.URDUSUKHAN.COM
اردو سخن ڈاٹ کام